ماہنامہ

اشراق

لاہور

جنوری ۲۰۱۱

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

''ائمۂ اصول کی اصطلاح میں قطعیت احتمال کی نفی ہے۔ دلالت الفاظ کی بحث میں یہ لفظ دو معنی کے لیے بولا جاتا ہے: ایک، جب سرے سے احتمال نہ ہو۔ دوسرے، جب احتمال کی بنا جس دلیل پر رکھی جائے، وہ ناقابل التفات ہو۔ پہلے معنی کی مثال محکم اور متواتر ہیں اور دوسرے معنی کے لیے وہ ظاہر، نص اور خبر مشہور کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔''

—— شذرات

المورد

دارالاشراق

جاوید احمد غامدی

قطعی اور ظنی

ائمۂ اصول کی اصطلاح میں قطعیت احتمال کی نفی ہے۔ دلالت الفاظ کی بحث میں یہ لفظ دو معنی کے لیے بولا جاتا ہے: ایک، جب سرے سے احتمال نہ ہو۔ دوسرے، جب احتمال کی بنا جس دلیل پر رکھی جائے، وہ ناقابل التفات ہو۔ پہلے معنی کی مثال محکم اور متواتر ہیں اور دوسرے معنی کے لیے وہ ظاہر، نص اور خبر مشہور کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں*۔ استاذ مخلوف نے ''الموافقات'' پر اپنی تعلیقات میں لکھا ہے:

یستعمل القطع فی دلالة الالفاظ فیاتی علی نوعین: اولهما الجزم الحاصل من النص القاطع، وهو ما لایتطرقه احتمال اصلًا... ثانیهما العلم الحاصل من الدلیل الذی لم یقم بازائه احتمال یستند الی اصل یعتد به، و لایضره الاحتمالات المستندة الی وجوه ضعیفة او نادرة. (الموافقات، الشاطبی ۱/ ۱۳)

''یہ لفظ جب دلالت الفاظ کے باب میں استعمال کیا جاتا ہے تو دو صورتوں کے لیے آتا ہے: ایک اُس جزم کے لیے جو نص قطعی سے حاصل ہوتا ہے، یعنی وہ نص جس میں سرے سے احتمال کی گنجایش نہ ہو... دوسرے اُس علم کے لیے جو اُس دلیل سے حاصل ہوتا ہے جس کے مقابل میں کوئی ایسا احتمال نہ ہو جس کی بنا قابل لحاظ سمجھی جائے۔ نادر اور کمزور وجوہ پر مبنی احتمالات اُس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔''

اِسی قطعیت کو علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے کہ علم اُس صفت سے عبارت ہے

* التوضیح والتلویح، ابن مسعود الحنفی، مسعود بن عمر التفتازانی ۱/ ۲۴۲۔ کشاف اصطلاحات الفنون، التھانوی ۲/ ۱۲۰۰۔

جس سے حقائق میں ایسا امتیاز حاصل ہو جائے کہ نقیض کا احتمال نہ رہے۔ قرآن جب اپنے بارے میں کہتا ہے کہ وہ 'العلم' اور'الحق' ہے یا اپنے اندر تضادات کی نفی کرتا ہے تو اِسی حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ اِس کے مقابل میں لفظ ظن ہے۔ اِس میں احتمال کی نفی ممکن نہیں ہوتی، صرف ایک احتمال کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔ بعض کم سواد یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ علم جو غور و تفحص سے حاصل کیا جائے یا اُس میں غلطی کا امکان مان لیا جائے، وہ ظنی ہوتا ہے۔ ہر گز نہیں، غور و تفحص سے حاصل ہونے والے علم کو نظری کہا جاتا ہے جو قطعی بھی ہوتا ہے اور ظنی بھی۔ چنانچہ اُس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ 'هو الفكر الذى يطلب به من قام به علمًا او ظنًا'۔ آمدی نے مزید وضاحت کی ہے کہ'هو عام للنظر المتضمن للتصور و التصديق، والقاطع و الظنى'*۔ رہا غلطی کا امکان تو یہ محسوسات اور تجربیات تک میں مانا جاسکتا ہے، اِس لیے کہ انسان جب تک انسان ہے، غلطی سے مبرا نہیں ہوسکتا۔ ائمۂ اصول کی اصطلاح میں ظنی الدلالۃ کی تعبیر اِس کے لیے نہیں، بلکہ اُس کلام کے لیے اختیار کی جاتی ہے جس میں نقیض کا احتمال مان لیا جائے، یعنی تسلیم کر لیا جائے کہ ترجیح، بے شک اُسی مفہوم کی ہے جو 'هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ' سے بالعموم سمجھا جاتا ہے، لیکن اِس جملے کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ ایک نہیں ہے۔ اِس طرح کا احتمال ہے جو کسی کلام کو ظنی الدلالۃ بناتا ہے۔ رہے یہ احتمالات کہ 'هُوَ' مبتدا ہے اور لفظ 'اَللّٰهُ' اُس کی خبر ہے اور 'اَحَدٌ' دوسری خبر یا 'هُوَ' ضمیر الشان ہے اور 'اللّٰهُ اَحَدٌ' مبتدا اور خبر ہیں تو یہ مدعا کے احتمالات نہیں ہیں، تالیف کے احتمالات ہیں جو کلام کی قطعیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہی معاملہ اُن اختلافات کا ہے جو ہم ائمۂ سلف کے تفسیری اقوال میں دیکھتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے "مقدمۃ فی التفسیر" میں بالکل صحیح لکھا ہے:

فان منهم من يعبر عن الشئ بلازمه او بنظيره، و منهم من ينص على الشيئ بعينه، و الكل بمعنى واحد فى اكثر الاماكن، فليتفطن اللبيب لذالك.

(تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۱/۱۰)

"(یہ) اِس لیے (محسوس ہوتے ہیں) کہ اُن میں سے کوئی شے کو اُس کے لازم یا اُس کی نظیر سے تعبیر کر دیتا ہے اور کوئی کسی چیز کو بعینہٖ بیان کرتا ہے، لیکن معنی میں اختلاف نہیں ہوتا، وہ اکثر مقامات میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ یہ بات ہر عاقل کو سمجھ لینی چاہیے۔"

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ لفظ قطعیت کے جو معنی اوپر بیان ہوئے ہیں، قرآن کی تمام آیات اُنھی میں محصور ہیں۔

* اِن تمام تعریفات اور مباحث کے لیے دیکھیے: الاحکام فی اصول الاحکام، الآمدی ۱/۱۰۔ کشاف اصطلاحات الفنون، التھانوی ۲/۱۳۸۶۔

زیادہ تر آیتوں میں سرے سے کوئی احتمال نہیں ہے، اِس لیے کہ اُن کے الفاظ ہی اُن کی تفسیر ہیں اور اُن میں نسخ، تخصیص یا تبدیلی اور تغیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اِن کے علاوہ جتنی آیتیں ہیں، اُن کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ تمام احتمالات اُنھی میں پیدا کیے جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محل تدبر ہیں اور تدبر کا حق ادا نہ کیا جائے تو مدعا مخفی رہ جاتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حق ادا کیا جائے تو دلیل روز روشن کی طرح واضح کر دیتی ہے کہ اُس کے مقابل میں کوئی ایسا احتمال نہیں ہے جسے 'یستند الٰی اصل یعتد به'* قرار دیا جا سکے۔ دور حاضر میں قرآن کے جلیل القدر عالم اور محقق امام حمید الدین فراہی نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کا احتمال نہیں ہوتا۔ وہ قطعی الدلالۃ ہے۔ یہ محض قلت علم اور قلت تدبر ہے جو اختلافات کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن کے طالب علموں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ اُس کی تمام معنی آفرینی اِسی قطعیت کی تلاش میں پنہاں ہے۔ اُن کے یقین و اذعان کو اِس پر کبھی متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔

---

* یعنی ایسا احتمال جس کی بنا قابل لحاظ ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ، اِذْ قَالُوْا: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ.
قُلْ: مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ، تَجْعَلُوْنَهٗ

(حقیقت یہ ہے کہ) اِن لوگوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی، جب اِنھوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا[۱۲۱]۔ (اِن سے) پوچھو، پھر اُس کتاب کو کس نے نازل کیا تھا جس کو موسیٰ

۱۲۱؎ آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ یہ قول یہود کا ہے جو اُس زمانے میں قریش کو شہ دے رہے اور طرح طرح کے اعتراضات القا کر رہے تھے۔ اُن کے ذہن میں بات تو یہ رہی ہو گی کہ تورات کے بعد کسی نئی کتاب اور نئی شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی، اِس لیے اللہ اب کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کرے گا، لیکن اُنھوں نے بات اِس طرح کہی جس سے عربوں کی قومی حمیت بھی نہ بھڑکے اور اُن کا مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ قرآن نے پہلے اُن کے اِس قول کے ظاہر کو سامنے رکھ کر تبصرہ کیا کہ جو لوگ خدا کو اپنی مخلوقات سے اِس قدر بے تعلق سمجھیں کہ اُن کے اندر طلب ہدایت کا نہایت قوی داعیہ پیدا کر کے اُس نے اِس داعیے کا کوئی جواب نہیں دیا، اُن کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ صدیوں تک دین و شریعت کا حامل رہنے کے باوجود اُنھوں نے خدا کی قدر نہیں پہچانی اور اُس علیم و حکیم ہستی کے بارے میں نہایت غلط اندازہ قائم کیا ہے۔

قَرَاطِیۡسَ، تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِیۡرًا، وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ. قُلِ: اللّٰهُ، ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِیۡ خَوۡضِهِمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ

لے کر آئے تھے، جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جس کو ورق ورق کر کے اُنھیں دکھاتے اور زیادہ کو چھپا لیتے ہو[۱۲۲] اور (جس کے ذریعے سے) تمھیں وہ علم دیا گیا جسے نہ تم جانتے تھے نہ تمھارے باپ دادا؟ کہہ دو، اللہ ہی نے، پھر اِنھیں اِن کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں۔ یہ[۱۲۳] (اُسی کتاب کی طرح) ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے[۱۲۴]، جو کچھ اِس سے پہلے آ چکا

۱۲۲؎ یہود نے تورات کی جو ناقدری کی یہ اُس کا اظہار بھی ہے اور اُن کی بات کے باطنی پہلو کا جواب بھی کہ خدا کی کتاب کے ساتھ جو سلوک اُنھوں نے کیا ہے، اُس کے بعد تو ناگزیر ضرورت تھی کہ ایک نئی کتاب اور نئی شریعت نازل کی جائے تاکہ لوگ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آئیں اور گمراہی سے نجات حاصل کر لیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہود نے تورات اُس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو مابین الدفتین جمع کیا، بلکہ اُنھوں نے اُس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلم بند کیا تھا۔ اِس طرح اُن کو اُس کی اُن تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اُس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اُس کے جس جزو کو چاہے، اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الٰہی کے اخفا کا جو جرم عائد کیا ہے، اُس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی تھی اور قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اُس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے، اِس لیے کہ 'تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِیۡرًا' کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا تھا، وہ زیادہ تھا۔ اِس کے معنی لازماً یہ بھی ہوئے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا، وہ تھوڑا تھا۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۰۸)

۱۲۳؎ پہلے محض اشارہ فرمایا تھا۔ یہاں سے آگے اب قرآن کی مستقل حیثیت واضح کی جا رہی ہے کہ اِس کتاب کے نزول کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔

۱۲۴؎ یہ اُس عالم گیر خیر و برکت کی طرف اشارہ ہے جس کا ظہور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر

مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ، وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا، وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ، وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ

ہے، اُس کی تصدیق کرتی ہے[125] (اِس لیے کہ تم اِس کے ذریعے سے لوگوں کو خوش خبری دو) اور اِس لیے کہ اُنھیں متنبہ کر دو جو ام القریٰ اور اُس کے گردوپیش کے رہنے والے ہیں[126]۔ (تم مطمئن رہو)، جو آخرت کو مانتے ہیں، وہی اِسے مانیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں[127]۔ ۹۱-۹۲

اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے[128] یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی

قرآن کے نزول سے ہوا اور جس کی بشارت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اُس وقت دے دی گئی تھی، جب وہ خدا کے حکم پر اپنے بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ بائیبل کی کتاب پیدایش میں ہے:

> ''خداوند فرماتا ہے: چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے، دریغ نہ رکھا، اِس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا... اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔'' (۲۲: ۱۶-۱۸)

۱۲۵؎ یعنی اُن پیشین گوئیوں کی مصداق ہے جو اِس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں اور اِس لیے نازل کی گئی ہے کہ اُس پورے سلسلۂ نبوت کی صداقت پر ایک برہان قاطع بن جائے جو تورات کے نزول سے لے کر اب تک جاری رہا ہے۔

۱۲۶؎ اِس کا عطف اُس مفہوم پر ہے جو پہلے جملے سے نکلتا ہے۔ وضاحت قرینہ کی بنا پر اُسے حذف کر دیا ہے۔ قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے بیان ہوئی ہے، جن پر اتمام حجت کے لیے اُسے نازل کیا گیا اور جس کے نتیجے میں پورے عالم کے لیے اُس عظیم خیر و برکت کا ظہور ہوا جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

۱۲۷؎ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اُن کی تعریف کی ہے اور ہر جگہ یہی شناخت بتائی ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے اور اُس میں شب و روز آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔

۱۲۸؎ یعنی شرک کرے۔ اِسے جھوٹی تہمت سے اِس لیے تعبیر کیا ہے کہ مشرکین اپنے جی سے معبود گھڑتے اور اُن کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنھیں خدا نے اپنا شریک قرار دیا ہے۔ یہ قریش کا سب سے بڑا جرم تھا۔ چنانچہ

شَیْءٌ، وَّمَنْ قَالَ: سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ، وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ، اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ، اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ، وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ، وَّتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ

ہے، دراں حالیکہ اُس پر کوئی وحی نہ آئی ہو اور اُس سے جو دعویٰ کرے کہ میں بھی اُس جیسا کلام نازل کر سکتا ہوں، جیسا خدا نے نازل کیا ہے؟[129] اور کبھی تم دیکھتے،[130] جب یہ ظالم موت کی بے ہوشی میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالے کر دو، آج (تمھارے) اِس (جرم) کی پاداش میں تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا[131] کہ تم اللہ پر ناحق تہمت باندھتے تھے اور اُس کی آیتوں سے متکبرانہ اعراض کرتے تھے۔[132] لو، بالآخر ویسے ہی اکیلے اکیلے ہمارے پاس آ گئے ہو،[133]

اہل کتاب کے مفسدین کا ذکر کرنے کے بعد قرآن نے اُن کی طرف توجہ فرمائی ہے تو سب سے پہلے اُن کے اِسی جرم کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۹؎ یہ اُن ہفوات کا حوالہ ہے جو قریش کے لیڈر بکتے رہتے تھے تاکہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دعوے کا کوئی اثر قبول نہ کریں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ آپ کی اپنی کوئی بات نہیں، بلکہ خدا کا کلام ہے جو خدا کی طرف سے اُس کے ایک فرشتے کے ذریعے سے نازل کیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اُس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اُس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اِسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اُن کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام اُن کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اُس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اِس قسم کی نمائشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے سکتی ہے۔ بالآخر اِن زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۱۱۱)

۱۳۰؎ یہ شرط ہے اور آگے اِسی کا بیان ہے۔ اِس کا جواب اِس لیے حذف کر دیا ہے کہ جس ہولناکی کو چشم تصور کے سامنے لانا پیش نظر ہے، وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتی تھی۔

۱۳۱؎ ذلت کا عذاب اِس لیے کہ اِن متمردین نے خدا اور اُس کے رسول کے مقابلے میں سرکشی اور تکبر کا رویہ

ظُهُوْرِكُمْ، وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا، لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ، وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

جیسے پہلی مرتبہ ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا، جو کچھ (دنیا میں) تمھیں دیا تھا، وہ سب پیچھے چھوڑ آئے ہو اور تمھارے ساتھ ہم تمھارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھ رہے جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے کہ تمھارے معاملے میں ہمارے شریک ہیں۔ تمھارے سب رشتے ٹوٹ گئے[۱۳۴] اور جو کچھ گمان تم کیے بیٹھے تھے، وہ سب جاتے رہے ہیں[۱۳۵]۔ ۹۳-۹۴

اختیار کیا۔

۱۳۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ'۔ 'عَنْ' کا صلہ دلیل ہے کہ 'تَسْتَكْبِرُوْنَ' کا لفظ یہاں اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔

۱۳۳؎ پیچھے غائب کا اسلوب تھا۔ اُس کے بجائے حاضر کا یہ اسلوب، اگر غور کیجیے تو اُن کے انجام کی ہولناکی کو اِس طرح نگاہوں کے سامنے لے آیا ہے گویا قیامت آ گئی اور اُن سے خطاب کیا جا رہا ہے۔

۱۳۴؎ اصل میں 'تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں فاعل ہمارے نزدیک حذف ہے، یعنی 'تقطع بينكم الحبل'۔

۱۳۵؎ یعنی ہمارے شریک ٹھیرا کر اور قیامت میں اُنھیں اپنا شفیع سمجھ کر جو گمان کیے بیٹھے تھے، وہ سب ہوا ہو گئے۔

[باقی]

طالب محسن

شرک کا انجام

قَالَ وَكِيعٌ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ بْنُ نُمَيْرٍ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ مَّاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَقُلْتُ أَنَا: وَمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ.

حضرت وکیع بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور حضرت ابن نمیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراتے ہوئے مرا، وہ جہنم میں گیا۔ میں نے کہا: اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراتے ہوئے مرا، وہ جنت میں گیا۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ: مَا الْمُوجِبَتَانِ؟ فَقَالَ: مَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ مَّاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ.

حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس

نے پوچھا: یارسول اللہ، دو لازمی امور کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوئے مرا، وہ جنت میں گیا اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہوئے مرا، وہ جہنم میں گیا۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ لَقِيَهُ يُشْرِكُ بِهِ دَخَلَ النَّارَ.

حضرت جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو اللہ سے اس طرح ملا کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا تھا تو وہ جنت میں گیا اور جو اس سے اس طرح ملا کہ وہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا تھا، وہ جہنم میں گیا۔

لغوی مباحث

'دخل الجنۃ'، 'دخل النار': بظاہر یہ لازم وملزوم کا اسلوب ہے۔ پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ شرک کا مجرم یقینی طور پر جہنمی ہے۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے، لیکن اس کے برعکس نتیجہ، یعنی مؤحد لازماً جنت میں جائے گا، یہ بات قرآن مجید کے بیان کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن مجید صحت عقیدہ کے ساتھ عمل صالح کو بھی لازم قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا جملہ مجانست کے اسلوب پر ہے، اسے پہلے جملے کے معنی میں لینا درست نہیں ہے۔

معنی

کچھ شارحین نے اس روایت کے محولہ بالا مسئلے کو شفاعت کے حوالے سے حل کیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک چونکہ توحید کا ماننے والا شفاعت کا مستحق ہے اور شفاعت کے نتیجے میں بخشا جائے گا، اس لیے دونوں جملے درست ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے، لیکن یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ وہ جرائم جن پر قرآن مجید نے ابدی جہنم کی وعید سنائی ہے، ان کے مرتکبین بھی شفاعت سے محروم رہیں گے۔ یہ بات شفاعت سے متعلق روایتوں میں بیان بھی ہوئی ہے: 'مَا بَقِيَ فِي النَّارِ إِلَّا مَنْ حَبَسَهُ الْقُرْآنُ وَوَجَبَ عَلَيْهِ الْخُلُوْدُ'، ''آگ میں وہی باقی رہ گیا ہے جسے قرآن نے روک لیا ہے، یعنی اس پر قرآن کی رو سے خلود واجب ہے۔'' (بخاری، رقم ۴۲۰۶)

قرآن مجید بالکل واضح ہے کہ مشرک کو مغفرت نہیں ملے گی۔ قرآن مجید میں یہ بات اس بات کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ اس کے سوا سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ قرآن کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ استغفار اور دوسری نیکیوں سے تلافی مافات ہوتی رہتی ہے۔ غالباً انھی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان روایات میں دونوں باتیں بیان ہوئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ توحید اور شرک کو ہمارے دین میں یہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ذات باری تعالیٰ کا شعور ہے۔ خدا کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق خدا سے صحیح تعلق، سارا دین اسی نکتے کی تفصیل ہے۔ اگر یہ بات ہی درست نہ ہوئی تو ایمانیات اور شریعت کی حقیقت ہی تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔ اور اگر یہ درست ہو تو امکان ہے کہ کوتاہیوں کے باوجود ایک مسلمان جادۂ مستقیم سے محروم نہیں ہوگا۔ روایت میں قول توحید کی بات نہیں ہوئی، بلکہ حالت توحید کی بات ہوئی ہے۔ جس کا حال باطن سچی توحید ہو، اس کی زندگی شرک و بدعت اور نفاق و بغی سے عبارت نہیں ہو سکتی اور یہی چیز بخشش کے امکانات کو بڑھا دیتی ہے۔

متون

کتب حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی مواقع پر بیان کی تھی۔ چنانچہ کہیں سوال کے جواب میں، کہیں گفتگو کے مابین اور کہیں بطور اصول یہ بات بیان ہوئی ہے۔ کسی روایت میں صرف توحید یا عدم شرک والا جملہ ہے اور کسی میں دونوں ہیں۔ کسی روایت میں یہ خبر بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات حضرت جبریل علیہ السلام نے بتائی تھی۔ کسی روایت میں یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہونے والی شفاعت کے اعزاز کی شرط کے طور پر بیان ہوئی ہے۔

'موجبتان' والی روایت کا بھی یہی معاملہ ہے۔ کسی میں مجرد یہی جملہ نقل ہوا ہے اور کسی میں یہ ایک مفصل بات کے جز کے طور پر منقول ہے۔

جہاں تک لفظی فرق کا تعلق ہے تو اس میں امام مسلم نے نمائندہ روایات نقل کر دی ہیں۔

کتابیات

بخاری، رقم ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۶۰۷۸، ۷۰۴۹؛ مسلم، رقم ۹۲، ۹۳؛ ترمذی، رقم ۲۶۴۴؛ احمد، رقم ۴۰۳۸، ۴۲۳۱،

۵۶۲۵، ۶۵۸۶، ۹۵۰۰، ۱۱۷۶۸، ۱۳۵۸۵، ۱۵۲۴۷، ۱۸۳۱۰، ۱۹۰۶۱، ۲۱۴۵۲، ۲۱۴۷۱، ۲۱۴۷۲، ۲۱۵۰۲، ۲۲۱۳۶، ۲۲۱۴۴، ۲۲۵۱۷، ۲۳۵۷۰، ۲۳۶۰۶، ۲۳۶۴۲، ۲۷۵۷۸؛ مسند عبد بن حمید، رقم ۴۱۳؛ السنن الکبریٰ، رقم ۱۰۹۶۳، ۱۰۹۶۸؛ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۱۰۲۶؛ ابن حبان، رقم ۲۱۳، ۳۳۲۶؛ مستدرک، رقم ۵۰۷۹؛ سنن بیہقی، رقم ۱۳۰۷۵، ۲۰۵۶۰۔

محمد وسیم اختر مفتی

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین
کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت سعد کے والد کا نام مالک بن وہیب (اہیب) تھا لیکن اپنی کنیت ابو وقاص سے مشہور تھے۔ عبد مناف حضرت سعد کے دادا اور زہرہ بن کلاب پڑ دادا تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ (بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ) اور حضرت سعد کے دادا ایک ہی تھے۔ ان کے والد وقاص آمنہ کے ماموں زاد تھے۔ کلاب بن مرہ پر حضرت سعد کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت سعد کی والدہ کا نام حمنہ بنت سفیان بن امیہ تھا، پانچویں پشت پر ان کی والدہ کا شجرہ قصی سے جا ملتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی پانچویں جد تھے۔ حضرت سعد کی کنیت ابو اسحاق اور نسبت زہری ہے۔

حضرت سعد ۱۷ (یا ۱۹) سال کی عمر میں حضرت ابو بکر کی دعوت پر مسلمان ہوئے۔ حضرت ابو بکر مشرف بہ اسلام ہونے کے فوراً بعد زبیر بن عوام، عثمان، طلحہ اور عبد الرحمان بن عوف کے ساتھ حضرت سعد کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ نے انھیں اسلام کی دعوت دی، قرآن سنایا اور اسلام کا حق ہونا ثابت کیا تو ان سب نے دین حق قبول کیا۔ اس حساب سے ان کا شمار پہلے ۸ مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ حضرت سعد خود کہتے ہیں، ''میں اسلام میں داخل ہونے والا تیسرا شخص تھا (پہلے دو خدیجہ اور ابو بکر تھے)۔ سات دن گزر گئے اور میری یہی پوزیشن (کل مسلمانوں کا تہائی) برقرار رہی۔ کسی نے مجھ سے پہلے اسلام قبول نہ کیا تھا، ہاں ایسے لوگ تھے جو اسی روز نعمت اسلام سے سرفراز ہوئے جس دن میں ایمان لایا تھا۔'' (بخاری: ۳۷۲۷، ۲۸۵۸) ابن حجر کہتے ہیں، ہو سکتا ہے، باقی مومنین اولین کا حال حضرت سعد سے مخفی رہا ہو یا ان کی مراد ہو کہ ان سے پہلے محض ۲ آزاد بالغ مرد مسلمان ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں ہے، ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے والا ساتواں مرد تھا۔'' (بخاری

:۵۴۱۲) پہلے ٦ ابوبکر، عثمان، علی، زید بن حارثہ، زبیر اور عبدالرحمان بن عوف تھے۔ایک اور روایت کے مطابق حضرت سعد کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوشیدہ رہ کر اسلام کی دعوت دے رہے ہیں تو وہ کوہ اجیاد کی کسی گھاٹی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کیا۔حضرت سعد بن ابی وقاص 'السابقون الاولون '(سورۂ توبہ: ۱۰۰) میں شامل ہوئے تو ان کی والدہ نے قسم کھالی کہ حضرت سعد سے بات کروں گی نہ کھاؤں پیوں گی حتیٰ کہ وہ اپنا دین چھوڑ دے۔حضرت سعد نے کہا،تو جانتی ہے، اگر تیری سو جانیں ہوتیں اور (میرے دوبارہ مشرک ہونے کی خواہش کرتے ہوئے) ختم ہو جاتیں تو بھی میں دین اسلام نہ چھوڑتا۔تین روز گزرے تھے کہ وہ بھوک سے بے ہوش ہو گئیں۔ان کے بیٹے عمارہ نے پانی پلا کر ان کی بھوک ہڑتال ختم کی۔سورۂ عنکبوت کی آیت: ۸ اسی موقع پر نازل ہوئی،''وان جاهداك لتشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما''۔اور اگر یہ دونوں (ماں باپ) تیرے درپے ہوں کہ تم میرے ساتھ ایسا شریک ٹھہراؤ جس (کے خدائی میں شریک ہونے) کی تمھارے پاس کوئی علمی (و یقینی) اطلاع نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا۔''(مسلم: ٦٣١٧، مسند احمد: ۱٦۱۴)

اسلام کے ابتدائی دور میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر نماز پڑھتے۔ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص کچھ صحابہ کے ساتھ مل کر نماز ادا کر رہے تھے کہ مشرکوں نے دیکھ لیا اور ان کو مارنے دوڑے۔حضرت سعد نے ایک مشرک کو اونٹ کے جبڑے کی ہڈی دے ماری تو وہ زخمی ہو گیا۔یہ شرک و اسلام کی کشمکش میں نکلنے والا پہلا خون تھا۔حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو قریش کے اسلام لانے کی غلط خبر ملی تو انھوں نے مکہ واپسی کا عزم کیا۔یہ اطلاع غلط ثابت ہونے پر ان میں سے اکثر پلٹ گئے۔تاہم، کچھ اہل ایمان مشرکین کی پناہ لے کر شہر مکہ میں داخل ہو گئے۔ابوحذیفہ بن عتبہ اپنے باپ کی حفاظت میں آئے،عثمان بن مظعون کو ولید بن مغیرہ کی پناہ ملی لیکن انھیں ایک مشرک کی امان میں آنا کھٹکنے لگا اس لیے اسے ٹھکرا دیا۔ایک مجلس جس میں لبید بن ربیعہ موجود تھے، مغیرہ کے بیٹے نے حضرت عثمان کی آنکھ پر تھپڑ دے مارا۔تب حضرت سعد بن ابی وقاص اٹھے اور مارنے والے کی ناک پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم نے مدینہ ہجرت کی اور اہل مدینہ کو قرآن پڑھانا شروع کیا۔ان کے بعد حضرت بلال، حضرت سعد اور عمار مدینہ پہنچے پھر عمر رضی اللہ عنہ نے ۲۰ صحابہ کی معیت میں مدینہ کا سفر کیا۔(بخاری: ۳۹۲۵) حضرت سعد اور ان کے چھوٹے بھائی عمیر مدینہ جا کر اس گھر اور باغ میں قیام پذیر ہوئے جو ان کے مشرک بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے قبیلۂ بنو عمرو بن عوف میں تعمیر کر رکھا تھا۔اس نے جنگ بعاث سے قبل مکہ میں

کسی کو قتل کر دیا تھا اس لیے بھاگ کر یثرب چلا گیا اور بنو عمرو میں چھپ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص اور مصعب بن عمیر میں مواخات قائم فرمائی۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت سعد بن معاذ ان کے انصاری بھائی تھے۔ حضرت سعد اور عبداللہ بن مسعود نے ایک تہائی پیداوار کے بدلے میں اپنی زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ (بخاری: باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ، مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب البیوع والاقضیہ: ۱۵۲)

حضرت سعد بن ابی وقاص کا شمار ان دس صحابہ میں ہوتا ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر جنت میں جائیں گے، عمر جنت میں ہوں گے، عثمان جنتی ہیں، علی جنت میں جائیں گے، طلحہ اہل جنت میں سے ہیں، زبیر جنتی ہیں، عبدالرحمان بن عوف جنت میں بسیرا کریں گے، حضرت سعد جنت میں ہوں گے، سعید جنتی ہیں اور ابوعبیدہ بن جراح کا حسن انجام جنتیوں کے ساتھ ہو گا۔'' (ابوداؤد: ۴۶۴۹، ترمذی: ۳۷۵۶، مسند احمد: ۱۶۲۹) عشرۂ مبشرہ میں سے چار حضرت سعد، طلحہ، زبیر اور علی ہم عمر تھے۔ حضرت سعد ان چھ صحابہ میں بھی شامل تھے جن کو حضرت عمر نے اپنا جانشین چننے کے لیے نامزد کیا تھا۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرا کے پہاڑ پر تھے کہ وہ ہلنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حرا ساکن ہو جا، تم پر ایک نبی، صدیق اور شہید کے علاوہ کوئی نہیں۔ تب ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ (مسلم: ۶۳۲۸) ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں لگا تار تین رات نشست فرمائی اور دعا کی، ''اللہ! اس دروازے سے ایسے بندے کو لانا جو تم سے محبت رکھتا ہو اور تو بھی اس سے محبت کرتا ہو'' تبھی اس میں سے حضرت سعد داخل ہوئے۔ (مستدرک حاکم: ۶۱۱۷) جابر بن عبداللہ کی روایت ہے، ہم ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ حضرت سعد آتے دکھائی دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ میرے ماموں ہیں، کوئی اپنا ماموں تو دکھائے۔'' (ترمذی: ۳۷۶۱)

حضرت سعد بن ابی وقاص نے تمام غزوات اور جنگوں میں حصہ لیا۔ مدینہ تشریف آوری کے ۷ ماہ تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مدینہ سے گزرنے والے قافلوں سے تعرض نہ کیا۔ رمضان ۱ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی سربراہی میں شام سے مکہ لوٹنے والے قریش کے قافلے کو روکنے کے لیے حمزہ بن عبدالمطلب کی قیادت میں ۳۰ مہاجرین کا ایک دستہ روانہ فرمایا۔ فریقین کے مابین صف آرائی ہو چکی تھی کہ مجدی بن عمرو نے صلح کرا دی۔ شوال ۱ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبیدہ بن حارث کی سربراہی میں ۶۰ یا ۸۰ افراد کا سریہ رابغ کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ جحفہ سے ۱۰ میل آگے احیا کے چشمے پر پہنچا تو ابوسفیان (یا مکرز بن حفص) کے ۲۰۰ افراد پر مشتمل قافلے سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔

جنگ نہ ہوئی تاہم، حضرت سعد بن ابی وقاص نے تیراندازی کی۔ یہ راہ اسلام میں چلنے والا پہلا تیر تھا۔ ذی قعدا ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو ۲۰ مہاجرین کے ساتھ خرار بھیجا۔ آپ ﷺ نے مقداد بن عمرو کو سفید پرچم عطا کیا۔ دن کو چھپتے اور رات کو پیدل سفر کرتے ہوئے یہ ۵ دن کے بعد خرار پہنچے تو معلوم ہوا، مشرکین کا قافلہ ایک روز پہلے یہاں سے جا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے خرار سے آگے نہ جانے کی ہدایت فرمائی تھی اس لیے یہ دستہ (سریۂ حضرت سعد بن ابی وقاص) واپس لوٹ آیا۔ غزوۂ ابوا: ربیع الاول ۲ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ودّان کا سفر کیا، بنوضمرہ کے سردار مخشی نے جیش نبوی ﷺ سے صلح کر لی اس لیے کوئی معرکہ پیش نہ آیا۔ ربیع الثانی ۲ ھ میں آپ ﷺ ۲۰۰ صحابہ کے ساتھ ۱۰۰ افراد اور ۲۵۰۰ اونٹوں پر مشتمل قریش کے ایک تجارتی قافلے کا پیچھا کرنے کے لیے نکلے جو امیہ بن خلف کی سربراہی میں جا رہا تھا۔ آپ ﷺ کا پرچم حضرت سعد بن ابی وقاص نے تھام رکھا تھا۔ یہ غزوۂ بواط تھا، اس میں بھی جنگ کرنا پیش نظر نہ تھا۔ جمادی الثانی ۲ ھ میں رسول اکرم نے قریش کی سرگرمیوں کی خبر لینے کے لیے عبداللہ بن جحش کی سربراہی میں ۱۲ مہاجرین کا ایک دستہ جس میں حضرت سعد بھی تھے، مکہ اور طائف کے بیچ واقع نخلہ کی طرف روانہ فرمایا۔ حران کے مقام پر عتبہ بن غزوان کا اونٹ کھو گیا جس پر حضرت سعد بھی اپنی باری سے سفر کر رہے تھے تو دونوں اسے تلاش کرنے لگ گئے۔ ابن جحش قافلے کو لے کر چلتے رہے اور نخلہ پہنچ گئے۔ کشمش، کھالیں اور دوسرا سامان تجارت لے کر قریش کا قافلہ گزرا تو انھوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ واقد بن عبداللہ نے تیر مار کر قافلے کے سردار عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قید کر لیا۔ نوفل بن عبداللہ فرار ہو گیا۔ عبداللہ بن جحش نے تاریخ اسلامی میں حاصل ہونے والے پہلے مال غنیمت کی اپنے تئیں تقسیم کر کے ۱/۵ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رکھ لیا حالانکہ خمس کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ قریش نے اپنے قیدی چھڑانے کے لیے فدیہ بھیجا تو آپ ﷺ نے اس وقت تک قبول نہ فرمایا جب تک حضرت سعد اور عتبہ صحیح سلامت واپس نہ آ گئے۔ دوسری روایت کے مطابق یہ غزوہ رجب کی ابتدائی تاریخوں میں ہوا۔ مشرکین کی طرف سے حرام مہینے کی حرمت پامال کرنے کا الزام لگا تو ارشاد ربانی نازل ہوا، ''ماہ حرام میں قتال کرنا بہت برا ہے لیکن اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا، اسے نہ ماننا، مسجد حرام کا راستہ بند کرنا اور وہاں کے رہنے والوں کو نکال باہر کرنا اس سے بھی بدتر ہے۔'' (سورۂ بقرہ ۲: ۲۱۷)

۲ ھ میں بدر کے میدان میں کفر و اسلام کا فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جان نثار صحابہ کے ساتھ بدر کے کنووں کے قریب قیام فرمایا۔ رات کے وقت آپ ﷺ نے قریش کے لشکر کے بارے میں معلومات

حاصل کرنے اور میدان جنگ میں پانی کی موجودگی کا جائزہ لینے کے لیے علی بن ابوطالب، زبیر بن عوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص کو بھیجا۔ وہ قریش کے دو غلاموں اسلم اور عریض کو پکڑ لائے جو پانی بھر رہے تھے۔ ان سے قریش کے لشکر کی تعداد، اس کی جنگی پوزیشنوں اور ذخیرۂ خوراک کے بارے میں اطلاعات ملیں۔ جنگ شروع ہوئی تو نُبیہ بن حجاج حضرت سعد اور حضرت حمزہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ حضرت سعد کے حصہ میں دو قیدی آئے۔ اس بات کو عبد اللہ بن مسعود نے یوں روایت کیا ہے، جنگ بدر کے دن حضرت سعد اور عمار اور میں مال غنیمت میں ساجھی تھے۔ حضرت سعد دو مشرکوں کو قید کر لائے، عمار اور میں کچھ نہ حاصل کر سکے۔ (ابوداؤد: ۳۳۸۸) حضرت سعد کے بھائی عمیر نے اسی روز شہادت پائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کم عمر ہونے کی وجہ سے انھیں لوٹا دیا تھا۔ جب وہ رو دیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت عطا فرمائی۔ تب حضرت سعد نے اپنی تلوار کی حمائل انھیں دے دی۔

جنگ احد میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کھڑے ہو کر تیر اندازی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیر پھینکو، تم قوی نوجوان ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ترکش سے تیر نکال کر انھیں پکڑاتے اور فرماتے، ''تیر پھینکو، میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔'' (بخاری: ۴۰۵۵، ترمذی: ۳۷۵۳) عائشہ بنت سعد اپنے والد کا قول بیان کرتی ہیں، اس دن میں تیر اندازی کرتا تو ایک خوب رو، گورا چٹا شخص تیر مجھے واپس لا دیتا۔ میں نے اسے نہ پہچانا، بعد میں مجھے خیال ہوا کہ وہ کوئی فرشتہ تھا۔ حضرت سعد خود روایت کرتے ہیں، جنگ احد کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فدیہ کی دعا (فداك ابی و امی، میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں) دیتے ہوئے اپنے والدین دونوں کا ذکر فرمایا۔ (بخاری: ۲۵۰۹، ۳۷۲۵، ۴۰۵۷) حضرت علی کہتے ہیں، نبیِ رحمت ؐ نے ان الفاظ میں حضرت سعد کے علاوہ کسی کو دعا نہیں دی لیکن ایک دوسری متفق علیہ روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر زبیر بن عوام کے لیے بھی یہی کلمات ''میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں'' ارشاد فرمائے۔ (بخاری: ۲۸۴۶، ۳۷۲۰، مسلم: ۶۳۱۲) ابن حجر کی وضاحت کے مطابق ہو سکتا ہے، زبیر کا واقعہ حضرت علی کے علم ہی میں نہ ہو جو جنگ خندق میں پیش آیا یا ان کی نفی خاص جنگ احد کے ضمن میں ہو۔ جنگ احد ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ اور اسامہ بن زید کی والدہ ام ایمن انصار کی چند عورتوں کے ساتھ پانی بھر رہی تھیں۔ حبان بن عرقہ نے تیر پھینکا جو ان کے دامن پر لگا تو وہ ہنسنے لگ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو تیر پکڑا کر فرمایا، یہ پھینکو، تیر اسے جا لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا، حضرت سعد نے اس سے بدلہ لے لیا، اے اللہ! حضرت سعد کی دعا قبول کر اور اس کا تیر نشانے پر لگا۔ ایک مشرک نے مسلمانوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے آگ سی لگا دی تو حضرت سعد نے اس کے پہلو کا نشانہ لے کر ایسا تیر

دے مارا جس کا پھل نہیں تھا۔اس کا تسمہ بند گر گیا تو آپ ﷺ بے ساختہ مسکرانے لگے۔(مسلم:۶۲۱۶) حضرت سعد نے اس روز کم ازکم ایک ہزار تیر برسائے۔ان کی شجاعت کی وجہ سے انھیں ''فارس اسلام'' (اسلام کا شہ سوار) کہا جاتا ہے۔

غزوۂ احد میں (ایک وقت ایسا تھا کہ) طلحہ اور حضرت سعد کے علاوہ آپ ﷺ کے پاس کوئی نہ رہا تھا۔(بخاری: ۴۰۶۰، مسلم:۶۳۲۱) حضرت سعد کے بھائی عتبہ نے پتھر مار کر نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دانت شہید کر دیے، آپ ﷺ کا ہونٹ بھی پھٹ گیا۔حضرت سعد کہتے ہیں، اس دن مجھ سے زیادہ عتبہ کے قتل کا کوئی حریص نہ تھا لیکن وہ میرے ہاتھ نہ آیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد میری تحریک کے لیے کافی تھا، اس شخص پر اللہ کا غضب ٹوٹے گا جس نے اس کے رسول ﷺ کا چہرہ خون آلود کر دیا۔عتبہ اسی سال جہنم رسید ہوا، آپ ﷺ کی بد دعا کے مطابق اسے ایمان نصیب نہ ہوا۔حضرت سعد کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں سفید کپڑوں میں ملبوس دو شخص سخت جنگ میں مصروف دیکھے۔کچھ دیر پہلے وہ وہاں نہ تھے اور بعد میں بھی نظر نہ آئے۔(بخاری:۴۰۵۴) یہ جبریل اور میکائیل تھے۔(مسلم:۶۰۷۰) حضرت سعد مزید کہتے ہیں، میں نے اور عبداللہ بن جحش نے یوم احد کو جو دعائیں مانگی تھیں، قبول ہوئیں۔میں نے اللہ سے التجا کی تھی، مشرکوں کا کوئی سورما میرے ہاتھوں مرے اور ایسا ہی ہوا۔ابوسعد بن ابوطلحہ انھی کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔

حضرت سعد بتاتے ہیں، ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں حصہ لیا تو کھانے کو کچھ نہ تھا۔صرف جھاڑ اور ببول کے پتے تھے جو ہم اونٹ بکریوں کی طرح کھا لیتے۔ہم میں سے ہر کوئی حاجت بھی بکریوں کی مینگنیوں کی طرح کرتا۔(بخاری: ۳۷۲۸، مسلم:۷۵۴۳) عتبہ بن غزوان کی روایت ہے، ہم سات آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، ہمیں درختوں کے پتوں کے سوا کھانے کو کچھ نہ ملا جن سے ہماری باچھیں زخمی ہو گئیں۔کوئی کپڑا نہ ملا تو میں اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک چادر لے کر پھاڑی اور آدھی آدھی لپیٹ لی۔اب ہم میں سے ایک ایک بڑے شہر کا گورنر بنا ہوا ہے اور اللہ کی پناہ! میں بھی اپنے جی میں بڑا اور اللہ کے نزدیک چھوٹا ہو گیا ہوں۔(مسلم:۷۵۴۵) سیدہ عائشہ کی روایت ہے، مدینہ آمد پر ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر سو نہ سکے تو فرمایا، کاش! میرے صحابہ میں سے کوئی بھلا انسان آج رات میری پہرے داری کرتا۔عائشہ فرماتی ہیں، ہم اسی بے خوابی کی کیفیت میں تھے کہ اسلحہ جھنجھنانے کی آواز سنی۔آپ ﷺ نے پوچھا، کون ہے؟ تو جواب ملا، حضرت سعد ہوں یا رسول اللہؐ! آپ ﷺ کی پاسبانی کرنے آیا ہوں۔آپ ﷺ نے حضرت سعد کے لیے دعا فرمائی اور سو گئے حتیٰ

کہ ہم نے آپ ﷺ کے خراٹوں کی آواز سنی۔ (بخاری: ۲۸۸۵، مسلم: ۶۳۱۰) ایک بار حضرت سعد کی موجودگی میں (کچھ لوگوں نے مانگا تو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں مال تقسیم کیا۔ آپ ﷺ نے ایک مہاجر صحابی (جعیل بن سراقہ) کو چھوڑ دیا جو حضرت سعد کے خیال میں ان سب سے زیادہ نیک اور شریف تھا۔ انھوں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! میرے خیال میں یہ مومن ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، سعد! میں ایک شخص کو دیتا ہوں حالانکہ دوسرا مجھے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس اندیشے کی بنا پر کہ اللہ اسے دوزخ میں اوندھے منہ نہ گرا دے۔ (بخاری: ۱۴۷۸، مسلم: ۲۹۶) حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک بار مال خمس میں سے ایک تلوار لا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی اور کہا، یہ مجھے ہبہ کر دیں۔ آپ ﷺ نے انکار کیا اور فرمایا، جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دو۔ (مسلم: ۴۵۷۸) آپ ﷺ کا انکار اس لیے تھا کیونکہ خمس عام اہل ایمان کے لیے نہیں ہوتا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص انصار سے بہت محبت رکھتے تھے۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل تھی۔ ان کے بیٹے عامر نے کہا، ابا جان! میں نے دیکھا ہے کہ آپ انصار سے ایسا بھلا سلوک کرتے ہیں جو کسی دوسرے سے نہیں کرتے تو انھوں نے پوچھا، بیٹے! کیا یہ بات تمھیں کھٹکتی ہے۔ عامر نے کہا، نہیں، میں تو آپ کے طرز عمل سے خوش ہوتا ہوں۔ تب حضرت سعد نے یہ ارشاد نبویؐ سنایا، انصار سے محبت مومن ہی کرتا ہے اور ان سے بغض ایک منافق ہی رکھ سکتا ہے۔ (بخاری: ۳۷۸۳، مسلم: ۱۴۹) حضرت سعد کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا بھی گزرا ہے جب انھوں نے اس کے خلاف طرز عمل اختیار کیا، تب شراب کی حرمت کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ حضرت سعد انصار و مہاجرین کے ایک گروہ کے ساتھ بادہ خواری کے لیے کھجوروں کے ایک باغ میں گئے۔ اونٹ کی بھنی ہوئی سری بھی وہاں پڑی تھی۔ حضرت سعد کہتے ہیں، میں نے ان کے ساتھ کھایا پیا۔ انصار و مہاجرین کا ذکر ہوا تو میں نے کہا، مہاجرین انصار سے بہتر ہیں۔ ایک شخص نے اونٹ کا جبڑا اٹھا کر مجھے دے مارا تو میرا ناک زخمی ہو گیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر یہ واقعہ سنایا تو اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، ''یایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون''، اے اہل ایمان! بلا شبہ شراب، جوا، بت اور پانسے یہ سب شیطان کے ناپاک اعمال ہیں، ان سے بچتے رہو تا کہ نجات پاؤ۔ (سورۂ مائدہ: ۹۰) (مسلم: ۶۳۱۷) حضرت سعد کہتے ہیں، سورۂ انعام کی آیت ۵۲، ''ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی یریدون وجھہ، اے نبی! ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ ہٹائیں جو اپنے رب کی خوشنودی چاہنے کے لیے صبح و شام اسے پکارتے ہیں۔'' ہم چھ کے بارے میں نازل ہوئی، مشرک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں اپنے پاس نہ بیٹھنے دیں۔ انھوں نے ان میں سے تین کے نام نہیں بتائے، باقی تین یہ

تھے،سعد،عبداللہ بن مسعوداور بلال۔(مسلم:۶۳۲۰)

صلح حدیبیہ کے موقع پرحضرت علی نے معاہدہ کی تحریر لکھی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر جن مسلمانوں کی گواہی ثبت کرائی ،حضرت سعد بن ابی وقاص ان میں سے ایک تھے ۔ان کے علاوہ حضرات ابوبکر،عمر،علی اور عبدالرحمان بن عوف نے دستخط کیے۔فتح مکہ کے موقع پرحضرت سعدرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ ۳ پرچم برداروں میں سے ایک تھے۔ان کے پاس مہاجرین کا علم پرچم تھا۔ابوسفیان پران کا گزر ہوا تو یوں قدح کی،آج (مشرکین) کی حرمتیں پامال ہوں گی۔ابوسفیان نے نبی صلی اللہ علیہ سلم کو شکایت کی تو آپ ﷺ نے پرچم ان سے لے کرزبیر بن عوام کو دے دیا۔حضرت سعد کے بھائی عتبہ بن وقاص نے ان کو وصیت کررکھی تھی،زمعہ کی باندی کا بیٹا تم لے لینا کیونکہ وہ میری اولاد ہے۔مکہ فتح ہوا تو حضرت سعد اس بچے کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے،عبد بن زمعہ بھی ساتھ تھا۔حضرت سعد نے کہا، یہ میرا بھتیجا ہے،عبد نے اصرار کیا، یہ میرا بھائی ہے کیونکہ میرے باپ زمعہ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔آپ ﷺ نے بچے کو بغور دیکھا، وہ عتبہ سے گہری مشابہت رکھتا تھا پھر بھی فرمایا،عبد بن زمعہ یہ تیرے پاس رہے گا کیونکہ اس نے تیرے باپ کے بستر پر جنم لیا ہے۔آپ ﷺ نے یہ اصول بھی ارشادکیا،الولد للفراش وللعاھرالحجر ،بچہ اسی کا ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کو پتھر پڑیں گے۔آپ ﷺ نے ام المومنین سودہ بنت زمعہ کو اس کے سامنے جانے سے روک دیا کیونکہ وہ بچے کی عتبہ سے مشابہت دیکھ کر جان سکتی تھیں کہ وہ ان کا بھائی نہیں۔(بخاری:۲۰۵۳،۲۵۳۳)

حجۃ الوداع کے موقع پرحضرت سعد بن ابی وقاص شدید بیمار ہو گئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں مکہ چھوڑ کرحنین روانہ ہوئے پھرجعرانہ سے عمرہ ادا کرنے کے بعد ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔حضرت سعد درد سے مغلوب ہو رہے تھے،انھوں نے پوچھا، یارسول اللہ! میں صاحب ثروت ہوں اور (اس وقت) ایک بیٹی کے علاوہ میرا کوئی وارث نہیں، کیا اپنے مال کا دو تہائی (۲/۳) حصہ انفاق کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا،نہیں۔انھوں نے نصف (۱/۲) کی اجازت مانگی تو بھی آپ ﷺ نے نفی میں جواب دیا۔پھر پوچھا تو کیا ایک تہائی (۱/۳) دے ڈالوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! ایک تہائی بہت ہے۔تم اپنے وارثوں کے لیے مال و دولت چھوڑ کر مرو، یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تم جو انفاق بھی کرو گے،اس کا اجر پاؤ گے حتیٰ کہ اپنی اہلیہ کے منہ میں لقمہ ڈالو گے (تو وہ بھی کارثواب ہو گا)۔(بخاری:۱۲۹۵،مسلم:۴۲۱۸)

(باقی)

خورشید ندیم

زندہ خانقاہ

رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا اجتماع جاری ہے، یہ اجتماع کیا ہے؟ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔۱۹۴۱ء کے یہی دن تھے جب ہندوستان کے ایک گاؤں ''نوح'' میں ایسا ہی ایک اجتماع منعقد ہوا۔اس میں مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ جیسی شخصیات شریک تھیں۔بانی تحریک مولانا محمد الیاس بھی تھے۔مولانا ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''یہ اجتماع اور انسانوں کا یہ جنگل ایک جلسہ سے زیادہ ایک زندہ خانقاہ تھی۔دن کے سپاہی رات کے راہب بن جاتے تھے اور رات کے عبادت گزار دن کے خدمت گزار نظر آتے تھے۔'' یہ تبلیغی جماعت کیا ہے.... چلتے چلتے مولانا وحیدالدین خاں کے الفاظ میں اس سوال کا جواب بھی سنتے جائیں: ''تحریکیں عام طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں۔ایک وہ جو نظام کی بنیاد پر اٹھتی ہیں، دوسری وہ جو انسان کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔اوّل الذکر کا نشانہ اجتماع ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا فرد۔تبلیغی تحریک وہ تحریک ہے جس کا نشانہ فرد ہے۔ایک انسان کو اس کے رب سے جوڑنا۔ایک انسان کو آخرت میں کامیاب انجام کے قابل بنانا، یہ اس کا مقصد ہے۔اس کے سوا جو چیزیں ہیں،ان کو وہ انعامِ خداوندی کے خانے میں ڈالتی ہے نہ کہ براہ راست جدو جہد کے خانے میں۔تبلیغی تحریک کیا ہے؟ایک لفظ میں وہ خدا اور انسان کی دریافت ہے۔انسان کی روح ایک ایسا قابلِ اعتماد مرکز چاہتی ہے جو اس کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز ہو۔جو اس کے سفرِ حیات کی منزل بن سکے۔جس سے وہ سوال کرے اور جواب پائے۔جس سے وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو وابستہ کر سکے۔جو اس کی ہستی کے تمام مطالبات کی تکمیل ہو۔اس طرح کے ایک مقام کو پانا ہی روح کے لیے زندگی کا ملنا ہے۔اس کے بغیر روح اپنے کو بے جگہ سمجھے گی

اور خلا میں معلق پڑی رہے گی۔ تبلیغی تحریک، نفسیاتی مفہوم میں، انسان کی روح کو اس کا مرکز اور مرجع فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ وہ انسان کو خدا سے ملانے کی ایک مہم ہے۔''

میں اس میں مزید ایک نکتے کا اضافہ کرتا ہوں۔ یہ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ انسانیت سے جوڑنے کی ایک کاوش ہے۔ یہ بات سمجھ نہیں آسکتی اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انسانیت کے تعلق کو پہلے دریافت نہ کریں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ انبیا و رسل کی پھیلی ہوئی کہکشاں میں اس مہ کامل کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں۔ یہ محض ایک عقیدہ نہیں ایک ایسی خبر ہے جس سے پورے عالمِ انسانیت کی نجات وابستہ ہے۔ اللہ کا آخری الہام اور وحی ان کے قلبِ اطہر پر نازل ہوئی۔ آج اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ اس عالم کا پروردگار اپنے بندوں سے کیا چاہتا ہے تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ آپ کے قدموں میں آکر بیٹھ جائے۔ ہدایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ مقید ہو گئی۔ جو ان پر ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے وہ اپنے اس دعوے میں صادق نہیں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دنیا کے ہر رشتے، ہر تعلق اور ہر شے سے زیادہ عزیز نہ ہو جائیں۔ اس عقیدے کا ایک اظہار یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والا آپ کو اپنا آئیڈیل بنا لے۔ دین کے باب میں انھوں نے جو کہا، کیا اور جسے کلام الٰہی کے حیثیت سے پیش کیا اسے ہی دین سمجھے۔ بلا شبہ وہ اس دین کو سمجھے گا، اس پر غور کرے گا اور اپنی عقل سے راہنمائی لے گا۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ اس کی عقل ٹھوکر کھا جائے، رشوت لے لے۔ اس صورت میں وہ اپنی عقل کی بلوغت کا انتظار کرے گا لیکن مانے گا وہی جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور دین پیش کیا۔ عقل کہتی رہے کہ لاٹھی سانپ نہیں بن سکتی لیکن وہ یہ تسلیم کرے گا کہ سیدنا موسیٰ کی لاٹھی اپنے رب کے حکم سے سانپ بن گئی تھی۔ لوگ اپنی جہالت آشکار کرتے رہیں کہ اس دور میں کوڑوں کی سزا مناسب نہیں لیکن وہ اس پر ایمان رکھے گا کہ قیامت کی صبح تک زنا کی حد سو کوڑے ہیں کیونکہ یہ اس کتاب میں لکھ دی گئی ہے جسے اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ کوئی مغرب کا ہو یا مشرق کا، اگر اعتراض اٹھائے کہ معاذ اللہ ہاتھ کاٹنا وحشیانہ سزا ہے تو وہ اپنی آواز بلند کرے گا کہ چور مرد ہو یا عورت، اس کی حد ہاتھ کاٹنا ہی ہے۔ دلیل یہ کہ کتاب اللہ میں یہی درج ہے۔ کوئی الصلوٰۃ کا مفہوم لغت سے طے کرے گا تو وہ دنیا کو بتائے گا کہ یہ حق صرف اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ الصلوۃ کیا ہے، کن اوقات میں کتنی رکعتوں کے ساتھ اور کیسے پڑھی جائیں گی۔ اس میں لغت نہیں، اللہ کے رسول کی سنت ماخذ بالذات ہے جس طرح قرآن ماخذ بالذات ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے گا جو اس

نعمت سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ کام اپنی استطاعت، علم اور رسائی کی حد تک ہی کر سکے گا لیکن اسے بہر حال یہ کام کرنا ہے۔ یہ آپ پر ایمان لانے والوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ کچھ لوگ پہلے خود سیکھیں اور پھر اسے ان تک پہنچائیں جو اس سے بے خبر یا بے نیاز ہیں۔ قرآن مجید کے مطابق، یہ ممکن نہیں کہ سب لوگ اس کام پر لگ جائیں لیکن ایسا ضرور ہو کہ ایک قوم میں سے کچھ لوگ اٹھیں جو دین کا فہم حاصل کریں اور دوسروں کو انذار کریں (۹:۱۲۲)۔ یہ انذار کیا ہے؟ یہی کہ لوگوں کو خبردار کیا جائے کہ انھیں اپنے اللہ کے حضور میں پیش ہونا اور اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔ بدقسمتی سے امت کی سطح پر اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کا یہ پہلو وہ اہمیت حاصل نہیں کر سکا جس کا یہ مستحق تھا۔ تبلیغی جماعت ہمیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین داعی اور مدعو کا تعلق کمزور پڑ رہا ہے جسے مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

دین کے احیا، بقا اور فروغ کی ہر کوشش لائقِ تحسین ہے۔ بایں ہمہ تبلیغی جماعت سمیت ایسی ہر کوشش اس کی سزاوار ہے کہ اسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے قائم شدہ معیارات پر کھا جائے۔ اجتہاد، جہاد، حکومت اور دعوت سمیت، دین کے عنوان سے کیا جانے والے ہر کام جانچا جائے گا کہ قرآن وسنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ تبلیغی جماعت، ظاہر ہے کہ اس سے مستثنا نہیں۔ تاہم، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر سال انھی دنوں میں جب یہ زندہ خانقاہ آباد ہوتی اور ساری دنیا سے مسلمان یہاں جمع ہوتے ہیں تو وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہی ہدایت کا واحد اور ابدی مرکز ہے۔ کتاب الٰہی آپ کے توسط سے ہمیں ملی اور سنت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طریقہ ہے۔ یہی دین ہے جسے ہم نے ان تک پہنچانا ہے جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

محمد عمار خان ناصر

غلبۂ دین بطور دلیل نبوت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

حارث بن ابی شمر شاہ غسان کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شجاع بن وہب کو خط دے کر بھیجا۔ پہلے پہل تو اس نے متکبرانہ رویہ اختیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کے لیے لشکر کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ تاہم قیصر روم نے اس کو اس ارادے سے منع کیا جس کے بعد حارث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کا انعام واکرام کر کے اسے رخصت کر دیا۔ حارث کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جانشین جبلہ بن ایہم کو دوبارہ اسلام کی دعوت بھیجی جو اس نے قبول کر لی۔

بحرین میں فارسی سلطنت کے زیر سایہ حکومت کرنے والے بادشاہ منذر بن ساویٰ کے نام خط دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاء بن الحضرمی کو بھیجا تو اس نے آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد اہل ایمان کو جزیرۂ عرب اور اس کے گرد ونواح کی سلطنتوں کا اقتدار حاصل ہونے کی بشارتیں بھی مختلف مواقع پر ایک تسلسل کے ساتھ دیں۔ اس نوعیت کی روایات کتب حدیث میں کثرت سے نقل ہوئی ہیں۔ یہاں ان میں سے اہم روایات نقل کی جاتی ہیں:

تمیم داری روایت کرتے ہیں:

سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول لیبلغن هذا الامر ما بلغ اللیل والنهار ولا یترك اللّٰه بیت مدر ولا وبر الا ادخله اللّٰه هذا الدین بعز عزیز او بذل ذلیل عزا یعز اللّٰه به الاسلام وذلا یذل اللّٰه به الکفر.

(مسند احمد، رقم ۱۶۲۴۴)

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا: یہ دین وہاں تک پہنچے گا جہاں تک دن اور رات کا سلسلہ موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ شہروں اور دیہات کا کوئی گھر ایسا نہیں چھوڑے گا جس میں یہ دین داخل نہ ہو جائے۔ کچھ لوگ تو عزت پائیں گے اور کچھ ذلیل ہوں گے۔ عزت تو اللہ تعالیٰ اسلام کو بخشیں گے جبکہ ذلت اہل کفر کا نصیب بنے گی۔''

ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اللّٰه زوی لی الارض فرایت مشارقها ومغاربها وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی منها. (مسلم، رقم ۵۱۴۴)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ نے میرے لیے زمین سمیٹ دی اور میں نے اس کے مشرق ومغرب کے علاقے دیکھ لیے اور بے شک میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں تک پہنچے گی جو مجھے سمیٹ کر دکھائے گئے۔''

ابو ہریرہ سے روایت ہے:

ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذا هلك کسری فلا کسری بعده واذا هلك قیصر فلا قیصر بعده والذی نفسی بیده لتنفقن کنوزهما فی سبیل اللّٰه. (بخاری، رقم ۲۸۸۸)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی دوسرا کسریٰ پیدا نہیں ہو گا۔ اور جب قیصر کی حکومت (شام کے علاقے سے) ختم ہو جائے گی تو دوبارہ کبھی قائم نہیں ہو گی۔ اور اللہ کی قسم، ان دونوں کے خزانے اللہ کے راستے میں خرچ کیے جائیں گے۔''

سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ بشارت دی:

هذه فتوح یفتحها اللّٰه علیکم بعدی یا سلمان، لتفتحن الشام ویهرب هرقل الی اقصیمملکته وتظهرون علی

''اے سلمان، یہ وہ فتوحات ہیں جو تمھیں میرے بعد حاصل ہوں گے۔ شام فتح ہوگا اور ہرقل بھاگ کر اپنی مملکت کے پرلے کنارے کی طرف چلا جائے گا

الشام فلا ينازعكم احد، ولتفتحن اليمن وليفتحن هذا المشرق ويقتل كسرى بعده. (المغازی ۲/ ۴۵۰)

اور تمھیں شام پر غلبہ حاصل ہوگا اور کوئی اسے تم سے چھیننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اور یمن بھی لازماً فتح ہوگا اور یہ مشرق کے علاقے بھی تمہارے قبضے میں آئیں گے جس کے بعد کسریٰ قتل کر دیا جائے گا۔''

غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ نے فرمایا:

الا ابشركم؟ قالوا بلى يا رسول الله وهم يسيرون على رواحلهم فقال ان اللّٰه اعطانى الكنزين فارس والروم وامدنى بالملوك ملوك حمير يجاهدون فى سبيل الله وياكلون فىء الله. (المغازی ۳/ ۱۰۱۱)

''کیا میں تمھیں خوشخبری نہ دوں؟ صحابہ نے اپنی سواریوں پر چلتے چلتے کہا: یا رسول اللہ، کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے دو خزانے عطا فرمائے ہیں۔ ایک فارس کا اور دوسرا روم کا۔ اور اس نے حمیر کے بادشاہوں کے ذریعے سے میری مدد کی ہے جو اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور اس راہ میں حاصل ہونے والا مال غنیمت کھائیں گے۔''

عدی بن حاتم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

اما انى اعلم ما الذى يمنعك من الاسلام تقول انما اتبعه ضعفة الناس ومن لا قوة له وقد رمتهم العرب اتعرف الحيرة قلت لم ارها وقد سمعت بها قال فوا الذى نفسى بيده ليتمن الله هذا الامر حتى تخرج الظعينة من الحيرة حتى تطوف بالبيت فى غير جوار احد وليفتحن كنوز كسرى بن هرمز قال قلت كسرى بن هرمزقال نعم كسرى بن هرمز وليبذلن المال حتى لا يقبله احد قال عدى بن حاتم فهذه الظعينة تخرج من الحيرة فتطوف بالبيت

''سنو، مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اسلام لانے میں کیا چیز مانع ہے۔ تم یہ سوچتے ہو کہ اس کی پیروی تو بس کچھ کمزور اور بے حیثیت لوگوں نے ہی اختیار کی ہے اور پورا عرب ان کے مقابلے پر کھڑا ہے۔ کیا تم حیرہ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا، میں نے دیکھا تو نہیں لیکن اس کے بارے میں سنا ہے۔ آپ نے فرمایا، پس اللہ کی قسم ہے کہ اس دین کا غلبہ اس طرح قائم ہوگا کہ حیرہ سے ایک عورت اونٹ پر سوار ہو کر تن تنہا بیت اللہ کا حج کرنے آئے گی اور کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح ہوں گے۔ میں نے تعجب سے پوچھا: کسریٰ بن ہرمز کے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، کسریٰ بن ہرمز کے۔ اور مال اتنا وافر ہو جائے گا کہ کوئی اس کو لینے

فی غیر جوار ولقد کنت فی من فتح کنوز کسری بن هرمز والذی نفسی بیده لتکونن الثالثة لان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قد قالها.
(مسند احمد، رقم ۱۷۵۴۸)

والا نہیں ملے گا۔ عدی بن حاتم کہتے ہیں: یہ دیکھو، حیرہ سے خاتون تن تنہا سوار ہو کر آتی ہے اور بیت اللہ کا حج کرتی ہے۔ اور میں خود ان لشکر میں شامل تھا جس نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کیے۔ اور بخدا، تیسری پیش گوئی بھی پوری ہو کر رہے گی، کیونکہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔''

عباس بن عبدالمطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

یظهر هذا الدین حتی یجاوز البحار وحتی تخاض البحار بالخیل فی سبیل اللّٰه تبارك وتعالی. (تفسیر القرطبی ۱۸/۱)

''اس دین کو غلبہ نصیب ہوگا یہاں تک کہ اس کے حدود سمندروں سے آگے چلے جائیں گے اور اللہ کے راستے میں سمندروں میں گھوڑے دوڑا دیے جائیں گے۔''

عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا فتحت علیکم فارس والروم ای قوم انتم؟ قال عبد الرحمٰن بن عوف نقول کما امرنا اللّٰه. (مسلم، رقم ۵۲۶۲)

''عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم فارس اور روم کو فتح کر لو گے تو پھر کیا کرو گے؟ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: ہم وہی کریں گے جو اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔''

ابوذر بیان کرتے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انکم ستفتحون مصر وهی ارض یسمی فیها القیراط فاذا فتحتموها فاحسنوا الی اهلها فان لهم ذمة ورحما او قال ذمة وصهرا. (صحیح مسلم، رقم ۴۶۱۵)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب تم مصر کو فتح کرو گے اور یہ وہ سرزمین ہے جس کے سکے کا نام قیراط ہے۔ پس جب تم اس کو فتح کر لو تو وہاں کے باشندوں سے اچھا سلوک کرنا، کیونکہ (ان کا دہرا حق ہوگا) وہ اہل ذمہ بھی ہوں گے اور ان کیساتھ رشتے داری بھی ہے۔''

بخاری میں سفیان بن ابی زہیر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تفتح الیمن فیاتی قوم یبسون فیتحملون باهلیهم ومن اطاعهم

''یمن فتح ہوگا تو کچھ لوگ (اونٹوں کو) ہانکتے ہوئے آئیں گے اور اپنے اہل خانہ کو اور جو ان کی بات مانیں،

والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون
وتفتح الشام فياتى قوم يبسون
فيتحملون باهليهم ومن اطاعهم
والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون
وتفتح العراق فياتى قوم يبسون
فيتحملون باهليهم ومن اطاعهم
والمدينة خير لهم لو كانوا يعلمون.
(بخاری، رقم ۱۷۷۶۔ مسلم، رقم ۱۳۸۸)

گے، انھیں بٹھا کر (یمن کی طرف) لے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا اگر وہ جانتے۔ اور شام فتح ہوگا تو کچھ لوگ (اونٹوں کو) ہانکتے ہوئے آئیں گے اور اپنے اہل خانہ کو اور جو ان کی بات مانیں گے، انھیں بٹھا کر (شام کی طرف) لے جائیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا اگر وہ جانتے۔ اور عراق فتح ہوگا تو کچھ لوگ (اونٹوں کو) ہانکتے ہوئے آئیں گے اور اپنے اہل خانہ کو اور جو ان کی بات مانیں گے، انھیں بٹھا کر (شام کی طرف) لے جائیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا اگر وہ جانتے۔‘‘

عقبۃ بن عامر روایت کرتے ہیں:

سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول ستفتح عليكم ارضون ويكفيكم اللّٰه فلا يعجز احدكم ان يلهو باسهمه. (مسلم، رقم ۱۹۱۷)

’’میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ عنقریب بہت سے علاقے تمھارے ہاتھوں مفتوح ہوں گے اور اللہ تمھاری مدد کے لیے کافی ہوگا، اس لیے تم میں سے کوئی اس سے عاجز نہ رہے کہ (لڑائی کی تیاری کی غرض سے) اپنے تیروں سے کھیلتا رہے۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام انھی بشارتوں کی روشنی میں اس یقین کے ساتھ ان قوموں کے خلاف میدان میں اترے کہ اللہ کی طرف سے فتح ونصرت ان کے لیے مقدر کر دی گئی ہے۔ تاریخ میں ان کے جو بیانات نقل ہوئے ہیں، ان سے صاف واضح ہے کہ وہ اپنے جنگی اقدامات کی تعبیر اسی وعدۂ الٰہی کی روشنی میں کرتے اور ان میں کامیابی کو اللہ کی طرف سے فتح ونصرت کے وعدے کی بنا پر یقینی خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اہل فارس کی طرف لشکر روانہ کرنے سے پہلے سیدنا عمر نے مسلمانوں سے خطاب کیا اور فرمایا:

المهاجرون عن موعود اللّٰه سيروا فى الارض التى وعدكم اللّٰه فى الكتاب ان يورثكموها فانه قال ليظهره على

’’حجاز تمھارا مستقر نہیں بن سکتا جب تک کہ تم وسائل معاش کی تلاش میں باہر نہ نکلو۔ اہل حجاز کے یہاں رہنے کا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ

الدين كله والله مظهر دينه ومعز ناصره ومولى اهله مواريث الامم اين عباد الله الصالحون. (طبری ۴۴۵/۳)

جو اللہ کے وعدے کو حاصل کرنے کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر پردیسی بننا چاہتے ہیں؟ اس سرزمین میں گھس جاؤ جس کی ملکیت کا وعدہ اللہ نے تمہارے ساتھ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے دین کو دوسرے تمام دینوں پر غالب کر دے گا۔ اور اللہ یقیناً اپنے دین کو غالب اور اس کے ماننے والوں کو سرفراز کرے گا اور اس کے پیروکاروں کو قوموں کی سلطنتیں عنایت کرے گا۔ اللہ کے نیک بندے کہاں ہیں؟''

یرموک کے معرکے کے موقع پر معاذ بن جبل نے مسلمانوں کو اسی وعدہ الٰہی کی یاد دہانی کرائی:

الم تسمعوا لقول الله وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم فاستحيوا رحمكم الله من ربكم ان يراكم فرارا من عدوكم. (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۹،۸/۷)

''کیا تم نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ: وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم۔ اس لیے اللہ تم پر رحم کرے، اس بات پر اللہ سے حیا کرنا کہ وہ تمھیں تمھارے دشمن کے سامنے سے فرار ہوتا ہوا دیکھے۔''

سعد بن ابی وقاص نے ایک موقع پر لشکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

ان الله هو الحق لا شريك له فى الملك وليس لقوله خلف قال الله جل ثناؤه ولقد كتبنا فى الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثها عبادى الصالحون ان هذا ميراثكم وموعود ربكم وقد اباحها لكم منذ ثلاث حجج فانتم تطعمون منها وتاكلون منها وتقتلون اهلها وتجبونهم وتسبونهم الى هذا اليوم.

''بے شک اللہ ہی کی ذات حق ہے۔ کائنات کی پادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں اور جو کچھ اس نے فرمایا، اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: 'اور ہم نے (بنی اسرائیل کو) یاددہانی کرانے کے بعد زبور میں یہ بات لکھ دی تھی کہ اس سرزمین کی ملکیت اور وراثت میرے نیک بندوں کو ملے گی۔ سو یہ تمہاری ملکیت اور تمہارے ساتھ تمہارے رب کا وعدہ ہے۔ اس نے اس سرزمین کو تین سال سے تمہارے لیے مباح کر رکھا ہے۔ پس تم آج کے دن

(طبری ۵۳۱/۳)

تک اس میں سے کھلا بھی رہے ہو، خود بھی مستفید ہو رہے ہو، یہاں کے لوگوں سے ٹیکس بھی وصول کر رہے ہو اور انھیں قیدی بھی بنا رہے ہو۔''

صحابہ کو اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ ان کی کامیابی کا دارو مدار قلت و کثرت اور مادی اسباب و وسائل پر نہیں، بلکہ دین حق کے ساتھ ان کی وابستگی اور صبر واستقامت پر ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر نے شام کے محاذ پر اپنی افواج کو لکھا:

انتم انصار اللّٰہ واللّٰہ ناصر من نصرہ وخاذل من کفرہ ولن یوتی مثلکم عن قلة ولکن من تلقاء الذنوب فاحترسوا منہا. (البدایہ والنہایہ ۵/۷)

''تم اللہ کے مددگار رہو اور جو اللہ کی مدد کرے، اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور جو اس کا انکار کرے، اسے تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ تمھارے جیسا گروہ کبھی تعداد کے کم ہونے کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوگا، بلکہ صرف گناہوں کی وجہ سے شکست کھائے گا، اس لیے گناہوں سے بچتے رہو۔''

عمرو بن العاص نے یرموک کے موقع پر اسلامی لشکر سے کہا:

لقد سمعت ان المسلمین سیفتحونہا کفرا کفرا وقصرا قصرا فلا یہولنکم جموعہم ولا عددہم فانکم لو صدقتموہم الشد لتطایروا تطایر اولاد الحجل. (البدایہ والنہایہ ۱۰/۷)

''میں نے سنا ہے کہ مسلمان ان علاقوں کو ایک ایک بستی اور ایک ایک محل کر کے فتح کرتے رہیں گے، اس لیے دشمن کے بڑے بڑے لشکر اور ان کی تعداد تمھاری ہمت کو پست نہ کرنے پائے، کیونکہ اگر تم دل جمعی سے ان پر حملہ کرو گے تو وہ یوں منتشر ہو کر بھاگیں گے جیسے چکور کے بچے بھاگتے ہیں۔''

سیدنا علی نے ایک موقع پر فرمایا:

ان ہذا الامر لم یکن نصرہ ولا خذلانہ بکثرة ولا قلة ہو دینہ الذی اظہر وجندہ الذی اعزہ وامدہ بالملائکة حتی بلغ ما بلغ فنحن علی موعود من اللّٰہ واللّٰہ منجز وعدہ وناصر جندہ.

(البدایہ والنہایہ ۱۰۷/۷)

''اس دین کی فتح یا شکست کا مدار تعداد کی کثرت یا قلت پر نہیں۔ یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے غالب کیا ہے اور اللہ کا لشکر ہے جس کی تائید اور نصرت اس نے فرشتوں کے ذریعے سے کی ہے یہاں تک کہ یہ اس عروج کو پہنچ گیا ہے۔ ہم اللہ کے وعدے کے سہارے پر لڑتے ہیں اور اللہ اپنے وعدے کو پورا

کرنے والا اور اپنے لشکر کی مدد کرنے والا ہے۔''

صحابہ کفار کے ساتھ ان معرکوں میں اپنی نصرت و کامیابی کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر کردہ ان خاص واقعات کا نمونہ سمجھتے تھے جو اللہ تعالیٰ اپنی دینونت کے اظہار کے لیے وقتاً فوقتاً دنیا میں رونما فرماتا رہتا ہے:

معرکہ یرموک کے موقع پر خالد بن ولید نے اپنے لشکر سے کہا:

ان هذا يوم من ايام الله لا ينبغي فيه الفخر ولا البغي اخلصوا جهادكم واريدوا الله بعملكم. (البدایہ والنہایہ ۷/۷)

''یہ اللہ (کے فیصلوں کے ظہور) کے دنوں میں سے ایک دن ہے۔ اس میں نہ فخر کا اظہار مناسب ہے اور نہ سرکشی۔ اپنے جہاد کو خالص رکھو اور اپنے عمل سے اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت رکھو۔''

اسی موقع پر ابوسفیان نے لشکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

اللّٰه اللّٰه انكم دارة العرب وانصار الاسلام وانهم دارة الروم وانصار الشرك اللّٰهم ان هذا يوم من ايامك اللّٰهم انزل نصرك على عبادك. (البدایہ والنہایہ ۷/۹)

''اللہ اللہ، تم اہل عرب اور اسلام کے مددگار ہو اور تمھارے دشمن رومی ہیں جو شرک کے مددگار ہیں۔ اے اللہ، یہ تیرے (فیصلے ظاہر ہونے کے) دنوں میں سے ایک دن ہے۔ اے اللہ، اپنے بندوں پر اپنی مدد نازل فرما۔''

ان فتوحات کو لوگوں کی نظر میں نصرت الٰہی کا نشان بنانے کے حوالے سے صحابہ کی حساسیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیدنا عمر نے اس کے برعکس تاثر کی نفی کے لیے خالد بن ولید جیسے بلند پایہ جرنیل کو امارت سے معزول کر دیا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

انی لم اعزل خالدا عن سخطة ولا خيانة ولكن الناس فتنوا به فاحببت ان يعلموا ان الله هو الصانع. (البدایہ والنہایہ ۷/۸۱)

''میں نے خالد کو کسی بات پر ناراض ہو کر یا اس کی کسی خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا، بلکہ لوگ اس کی (بہادری اور جنگی مہارت کے) دھوکے میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لیے میں نے پسند کیا کہ لوگ جان لیں کہ کامیابی دلانے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔''

صحابہ کی ان کی فتوحات اور کامیابیوں کے پیچھے نصرت الٰہی کا یہ عامل ان کے دشمنوں پر بھی پوری طرح واضح تھا اور وہ اسے تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ اجنادین کے معرکہ سے پہلے رومی لشکر کے امیر قیقلان نے صحابہ کے حالات کو جانچنے کے لیے ایک آدمی بھیجا جس نے واپس آ کر اسے بتایا کہ:

وجدت قوما رهبانا بالليل فرسانا بالنهار والله لو سرق فيهم ابن ملكهم لقطعوه او زنى لرجموه فقال له القيقلان والله لئن كنت صادقا لبطن الارض خير من ظهرها. (البدایہ والنہایہ ۷/۷)

''میں نے ایسی قوم دیکھی ہے جو رات کو راہب بن جاتے ہیں اور دن کو گھڑ سوار۔ بخدا، اگر ان کے بادشاہ کا بیٹا بھی چوری کرے گا تو وہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے اور اگر بدکاری کرے گا تو اسے سنگسار کر دیں گے۔ قیقلان نے کہا کہ بخدا اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو (ان سے لڑنے کے بجائے) زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے۔''

ہرقل نے صحابہ کے مقابلے میں رومی لشکر کے شکست کھانے کے بعد اس کے اسباب پر غور کیا۔ اس نے اپنے لشکر سے پوچھا کہ کیا مسلمان تمھارے جیسے ہی انسان نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا، ہمارے ہی جیسے ہیں۔ ہرقل نے کہا کہ تعداد ان کی زیادہ ہے یا تمھاری؟ انھوں نے کہا کہ ہر معرکے میں ہماری تعداد ان سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اس نے پوچھا کہ پھر تم شکست کیوں کھا جاتے ہو؟ اس پر ایک بزرگ سردار نے کہا:

من اجل انهم يقومون الليل ويصومون النهار ويوفون بالعهد ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويتناصفون بينهم ومن اجل انا نشرب الخمر ونزني ونركب الحرام وننقض العهد ونغصب ونظلم ونامر بالسخط وننهى عما يرضى الله ونفسد في الارض فقال انت صدقتني. (البدایہ والنہایہ ۷/۱۵)

''اس لیے کہ وہ راتوں کو قیام کرتے اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔ وہ عہد کو پورا کرتے، نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں انصاف سے کام لیتے ہیں۔ اور ہم شراب پیتے، بدکاری کرتے، حرام کا ارتکاب کرتے، عہد توڑتے، غصب اور ظلم کرتے، اللہ کو ناراض کرنے والی باتوں کا حکم دیتے اور اس کو راضی کرنے والے کاموں سے منع کرتے اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ ہرقل نے کہا: تم نے مجھے درست وجہ بتائی ہے۔''

فارسی سپہ سالار ہرمزان نے بھی سیدنا عمر کے سامنے اپنی شکست کی وجہ یہی بیان کی اور کہا:

يا عمر انا واياكم في الجاهلية كان الله قد خلى بيننا وبينكم فغلبناكم اذ لم يكن معنا ولا معكم فلما كان

''اے عمر، جاہلیت کے دور میں اللہ ہمارے اور تمھارے مابین کوئی مداخلت نہیں کرتا تھا۔ سو چونکہ وہ نہ تمھارے ساتھ تھا اور نہ ہمارے ساتھ، اس لیے ہم تم

معکم غلبتمونا.

(البدایہ والنہایہ ۷/ ۸۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۵۲۴۹)

پر غالب تھے۔ پھر جب وہ تمھارے ساتھ ہو گیا تو تم ہم پر غالب آ گئے ہو۔''

دوسری روایت کے مطابق اس نے کہا:

کنا نحن وانتم فی الجاھلیة لم یکن لنا ولا لکم دین فکنا نعدکم معشر العرب بمنزلة الکلاب فاذا اعزکم اللّٰہ بالدین وبعث رسوله منکم لم نطعکم.

(سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱/ ۲۶۳)

''جاہلیت کے دور میں نہ ہمارا کوئی دین تھا اور نہ تمھارا، سوائے قوم عرب، ہم تمھیں کتوں کے برابر شمار کرتے تھے۔ پھر جب اللہ نے اپنے دین کے ذریعے تمھیں عزت دی اور اپنا رسول تم میں سے مبعوث کیا تو ہم نے تمھاری اطاعت نہ کی۔''

ایرانی سردار سیاہ نے ایک موقع پر اپنے ساتھیوں سے کہا:

ان ھولاء بعد الشقاء والذلة ملکوا اماکن الملوك الاقدمین ولا یلقون جندا الا کسروہ واللّٰہ ما ھذا عن باطل ودخل فی قلبه الاسلام وعظمته.

(البدایہ والنہایہ ۷/ ۸۹)

''یہ لوگ اپنی بدحالی اور ذلت کے بعد اب پرانے بادشاہوں کی سلطنتوں کے مالک بن گئے ہیں اور جو بھی لشکر ان سے ٹکراتا ہے، یہ اسے پاش پاش کر دیتے ہیں۔ بخدا اگر یہ باطل پر ہوتے تو انھیں یہ سرفرازی نہ ملتی۔ اس کے دل میں اسلام کا دبدبہ اور عظمت جاگزیں ہو گئی۔''

حاصل بحث

نبی صلی اللہ علیہ وسلم عام معنوں میں کوئی داعی، واعظ اور مبلغ نہیں تھے، بلکہ خدا کے آخری پیغمبر تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کو 'شہادت علی الناس' کے منصب پر فائز کیا گیا تھا اور حق و باطل کے امتیاز کو علیٰ رؤوس الاشہاد واضح کر دینے کے لیے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مخالفین کی تمام کوششوں، کاوشوں اور سازشوں کے علی الرغم آپ کا دین ان سب پر غالب آ کر رہے گا:

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ. (التوبہ ۹: ۳۳)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرک اس بات کو کتنا ہی ناپسند کرتے رہیں۔''

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ. (النور۲۴: ۵۵)

''اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر حال میں انھیں اس سرزمین میں اسی طرح اقتدار عطا کرے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو عطا کیا اور ان کے لیے ان کے دین کو لازماً مستحکم کر دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو یقیناً امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد بھی انکار کریں تو وہی بدکار رہیں۔''

یہ ایک وعدۂ الٰہی تھا جو تاریخ کی پوری روشنی میں نہایت شان کے ساتھ ظہور پذیر ہوا اور اس نے رہتی دنیا تک نبی عربی کے دعوائے نبوت کی صداقت کو تاریخ کے صفحات پر ثبت کر دیا۔ ابن قیم نے، دیکھیے، اس استدلال کو کس شان سے واضح کیا ہے:

''ایک مسیحی عالم کے ساتھ میرا مناظرہ ہوا۔ دوران گفتگو میں، میں نے اس سے کہا: تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراض نہیں کر سکتے جب تک کہ خود خدا کی ذات پر اعتراض نہ کرو اور عظیم ترین ظلم، حماقت اور فساد کی نسبت اس کی طرف نہ کرو۔ اس نے کہا: یہ بات کیسے لازم آتی ہے؟ میں نے کہا: اس سے بھی بڑھ کر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تمھیں خود خدا کے وجود ہی کا انکار کرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر محمد، جیسا کہ تم کہتے ہو، سچے نبی نہیں تھے بلکہ ایک ظالم بادشاہ تھے تو دیکھو انھیں اس کا پورا موقع ملا کہ وہ خدا پر افترا کریں اور ان باتوں کی نسبت خدا کی طرف کریں جو خدا نے نہیں کہیں۔ پھر یہ موقع انھیں مسلسل حاصل رہا اور مسلسل حلال وحرام کے فیصلے کرتے رہے، فرائض مقرر کرتے اور احکام شریعت متعین کرتے رہے، سابقہ ملتوں کو منسوخ کرتے رہے، اور انبیاء سابقین کے پیروکاروں کو قتل کرتے اور ان کی گردنیں مارتے رہے، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بناتے رہے اور ان کے اموال اور دیار کو بطور غنیمت حاصل کرتے رہے، حالانکہ وہ اہل حق تھے، اور اس میں یہاں تک گئے کہ ساری سرزمین عرب فتح کر لی۔ وہ یہ سارے کام یہ کہہ کر کرتے رہے کہ انھیں اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور خدا کو ان سے محبت تھے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو دیکھتے رہے اور یہ بھی کہ وہ اہل حق اور رسولوں کے پیروکاروں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ محمد خدا کی طرف ۲۳ سال تک اس جھوٹ کی نسبت کرتے رہے اور اللہ

اس سب کے باوجود ان کی تائید ونصرت کرتا رہا، ان کے امر کو غالب کرتا رہا اور مدد کے وہ اسباب انھیں فراہم کرتا رہا جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان کی دعاؤں کو قبول کرتا اور ان کے دشمنوں کو، ان کی طرف سے کوئی کارروائی کیے بغیر، ہلاک کرتا رہا۔ کبھی پیغمبر کی دعا کے نتیجے میں اور کبھی آپ کی دعا کے بغیر ہی از خود ان کا قلع قمع کرتا رہا۔ اس کے باوجود خدا محمد کی ہر اس حاجت کو پورا کرتا رہا جو انھوں نے اس سے مانگی، ان سے اچھے اچھے وعدے کرتا رہا اور پھر ان وعدوں کو اس کامل، اعلیٰ اور بہترین طریقے سے پورا کرتا رہا جس میں کسی وعدے کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ سب کچھ ہوا، جبکہ تمھارے بقول محمد نے انتہا درجے کے جھوٹ، افترا اور ظلم سے کام لیا، کیونکہ جو شخص خدا پر جھوٹ باندھے اور مسلسل باندھتا رہے، اس سے بڑا جھوٹا کوئی نہیں ہو سکتا، اور جو شخص اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی شریعتوں کو باطل کر دے، ان کو زمین سے ختم کر دے اور ان کی جگہ اپنی مرضی کی شریعت لے آئے، اور اللہ کے اولیاء اور جماعت اور اس کے رسولوں کے پیروکاروں کو قتل کرے، اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس سارے کام میں خدا کی نصرت محمد کو مسلسل حاصل رہی اور خدا ان سب کاموں کو برقرار رکھتا رہا۔ اس نے نہ ان کا ہاتھ پکڑا اور نہ ان کی گردن کاٹی، جبکہ وہ خود اپنے رب کی طرف سے یہ وحی بیان کرتا رہا کہ ''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، حالانکہ اس کی طرف کوئی وحی نہ آئی ہو، اور جو کہے کہ میں بھی اس طرح کا کلام اتاروں گا جیسا کہ خدا نے اتارا''۔

اب تمھیں، جو محمد کو جھوٹا کہتے ہو، دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی:

''یا تو یہ کہو کہ دنیا کا نہ کوئی خالق ہے اور نہ پروردگار، کیونکہ اگر دنیا کا کوئی صاحب قدرت وحکمت صانع اور مدبر ہوتا تو وہ اس جھوٹے پیغمبر کا ہاتھ پکڑ لیتا اور اس کا سخت مقابلہ کرتا اور اس کو ظالموں کے لیے ایک نمونہ عبرت بنا دیتا، اس لیے کہ جب دنیا کے بادشاہوں کے شایان شان یہی ہے تو زمین وآسمان کے رب اور احکم الحاکمین کے لیے کیوں نہیں؟

اور یا پھر خدا کی طرف ایسے اوصاف کی نسبت کرو جو اس کے شایان شان نہیں، مثلاً ناانصافی، حماقت، ظلم، مخلوق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گمراہ کرنا، بلکہ ایک جھوٹے کی نصرت کرنا اور اس کو زمین میں اقتدار عطا کرنا، اس کی دعاؤں کو قبول کرنا، اس کی وفات کے بعد بھی اس کے امر کو قائم رکھنا، اور اس کے کلمہ کو ہمیشہ غالب رکھنا، اس کی دعوت کو اور نسل در نسل علیٰ رؤس الاشہاد ہر مجمع اور مجلس میں اس کی نبوت کی گواہی کو ظاہر کرنا۔ کیا یہ کام احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین کا ہو سکتا ہے؟ پس تم نے محمد کی نبوت کا انکار کر کے خود رب العالمین کی ذات میں بہت بڑا عیب نکالا ہے اور اس پر شدید اعتراض کیا ہے بلکہ اس کے وجود کا بالکلیہ انکار کر دیا ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ دنیا میں بہت سے جھوٹے نمودار ہوئے، انھیں کچھ قوت وشوکت بھی ملی، لیکن انھیں اپنا مشن پورا کرنے کا موقع نہیں ملا اور نہ زیادہ مہلت ملی، بلکہ اللہ نے اپنے رسولوں اور ان کے پیروکاروں کو ان پر غالب کر دیا جنھوں نے اس کا نام ونشان مٹا دیا اور اس کی جڑ کاٹ دی اور اس کا مٹھ مار دیا۔ جب سے دنیا قائم ہے، خدا کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے یہاں تک کہ وہ اس زمین اور اس کے باسیوں کا وارث بن جائے۔

جب اس نے میری یہ بات سنی تو کہنے لگا: اس بات سے خدا کی پناہ کہ ہم محمد کو ظالم یا جھوٹا کہیں، بلکہ سب منصف مزاج اہل کتاب یہ مانتے ہیں کہ جو شخص محمد کے طریقے پر چلے اور ان کی پیروی کرے، وہ آخرت میں اہل نجات اور اہل سعادت میں سے ہوگا۔ میں نے کہا: لیکن جس کو تم جھوٹا کہتے ہو، کیا اس کے طریقے اور نقش قدم پر چلنے والا اہل نجات اور اہل سعادت میں سے ہو سکتا ہے؟ اب اسے یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا کہ محمد اللہ کے رسول تھے، لیکن اس نے کہا کہ وہ ہماری طرف مبعوث نہیں کیے گئے۔ میں نے کہا: تمھیں اس بات کی تصدیق بھی کرنی پڑے گی کیونکہ محمد کا یہ دعویٰ تواتر سے ثابت ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے دنیا کے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا امی۔ اور آپ نے اہل کتاب کو بھی اپنے دین کی دعوت دی اور ان میں سے جنھوں نے آپ کے دین کو قبول نہیں کیا، آپ نے ان کے ساتھ قتال کیا یہاں تک کہ وہ ذلت کے ساتھ جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس پر وہ کافر لاجواب ہو گیا اور فوراً وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔'' (زاد المعاد، ۶۲۵، ۶۲۶)

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب کے یہود نے آپ کی رسالت کے انکار کی مجال نہ پا کر یہی دوغلا موقف اختیار کیا تھا کہ آپ اللہ کے نبی تو ہیں لیکن آپ کی نبوت ورسالت پر ایمان لانا صرف عرب کے امیوں پر لازم ہے جبکہ اہل کتاب اس سے مستثنیٰ ہیں۔ بعد کے ادوار میں عرب اور عراق کے نصاریٰ بھی بالعموم اسی موقف کے قائل رہے۔ (سرخسی، شرح السیر الکبیر ۱/۱۵۱، ۱۵۲۔ ابو اللیث السمرقندی، فتاویٰ النوازل، ص ۲۰۸۔ ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، ۶۲۶/۲۸) تاہم مغربی کلیسا نے مغربی عوام کی ناواقفیت اور جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حقائق کو مسخ کرنے کی روش اپنائی اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایسی تصویر کشی کی جس کے نتیجے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیغمبر تو کجا، ایک شریف اور مہذب انسان ماننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ زمانے کی گردش نے علم اور معلومات کے تبادلے میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا اور اسلام کی تاریخ اہل مغرب کے لیے بھی روشنی میں آ گئی تو اسلام کے خلاف مغرب کے اجتماعی لاشعور میں موجود تعصب نے ایک علمی رنگ اختیار کر لیا۔ مطالعہ اسلام اور مطالعہ سیرت کے حوالے سے استشراق کی ساری تحریک کا ہدف دو لفظوں میں بیان کیجیے تو وہ یہ ہے کہ اسلام کے دور اول کی تاریخ کی مذہبی اور پیغمبرانہ تعبیر کو اس کی علمی واستدلالی بنیادوں سے محروم کر کے پیغمبر اسلام کو دنیا کے عام سیاسی مدبرین اور قومی قائدین

کی صف میں لا کھڑا کیا جائے اوران کی سرگزشت کی توجیہ نفسیات، عمرانیات اور تاریخ کے عام اصولوں کے تحت کی جائے۔ چنانچہ اس وقت پوری مغربی اسکالرشپ یا تو اس دور کے تاریخی ریکارڈ کو ہی، جو قرآن مجید، حدیث اور سیرت کے ذخیروں میں محفوظ ہے، سرے سے غیر مستند قرار دینے پر مصر ہے اور یا اس ذخیرے کو اصولاً قابل استدلال مان کر اس میں غیر معمولی طور پر نمایاں مذہبی عنصر کی توجیہ یہ کرتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نظر مقصد کے لیے مذہب کو محض ایک مفید نفسیاتی اور جذباتی وسیلے کے طور پر استعمال کیا اور یہ کہ وہ بلند پایہ قائد اور مدبر تھے اور ان کو حاصل ہونے والی کامیابی سراسر ان کی اعلیٰ حکمت عملی اور حکیمانہ تدبیروں کا نتیجہ تھی۔

یہ زاویہ نگاہ اہل مغرب کی تو مجبوری ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر وہ پیغمبر اسلام کے دعواے نبوت کے حق میں تاریخ کی سب سے بڑی شہادت کا سامنا نہیں کر سکتے، لیکن افسوس یہ ہے کہ تاریخ کے اس نازک دور میں، جب سیرت نبوی کے اس پہلو کو زیادہ قوت اور زیادہ واضح استدلال کے ساتھ نمایاں کرنے کی ضرورت تھی، مسلم اسکالر شپ نے اہل مغرب کے پراپیگنڈا سے مرعوب ہو کر کم وبیش اجتماعی طور پر ذہنی پسپائی کا رویہ اختیار کر لیا، چنانچہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے عرب وعجم کے نامی گرامی اہل علم عہد نبوی اور عہد صحابہ کے واقعات کی تعبیر نو میں مصروف ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا جہاد محض 'دفاعی' نوعیت کا تھا یا اس کا مقصد مخالفین کے فتنہ وفساد کو رفع کرنا تھا اور کفر واسلام کی کشمکش سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔*

---

* اس ضمن میں دور از کار تاویلات کے ایسے ایسے نمونے پیش کیے گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ سلم کے ارشاد: امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ (بخاری، رقم ۲۷۲۷) کو 'دفاعی جہاد' کے دائرے میں لانے کے لیے ایک تاویل یہ کی گئی ہے کہ 'اقاتل' کا لفظ ہی یہ بتاتا ہے کہ اس حدیث میں از خود جنگ کا اقدام کرنے کا نہیں بلکہ جنگ کا اقدام کرنے والے کفار کے خلاف لڑنے کا ذکر ہے۔ الدکتور سعید رمضان البوطی لکھتے ہیں:

> ''اقاتل کا لفظ افاعل کے وزن پر ہے اور جانبین کے اس فعل میں شریک ہونے پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ یہ لفظ اسی وقت بولا جا سکتا ہے جبکہ دونوں جانبوں سے لڑائی کی جا رہی ہو، بلکہ درحقیقت اس کا اطلاق ہوتا ہی اس صورت میں ہے جب کوئی شخص اس آدمی کے مدمقابل آئے جس نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ 'مقاتل' کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو زیادتی کا آغاز کرنے والا کا مقابلہ کرے۔ جو شخص لڑائی کا آغاز کرتا ہے، اس کو تو 'مقاتل' کہا ہی نہیں جا سکتا، بلکہ اس کو 'قاتل' کہا جاتا ہے جس نے یا تو قتل کے ارادے سے حملہ کیا یا بالفعل کسی کو قتل کر دیا۔ فعل میں اشتراک کا مفہوم اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ دوسرا فریق مقابلہ اور دفاع کے لیے اٹھ نہ کھڑا ہو۔''

حالانکہ عربی زبان کی معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ اس میں 'قاتل' کا لفظ جس طرح جوابی اقدام کے لیے

آتا ہے، اسی طرح جنگ کا آغاز کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس استعمال کی ان گنت مثالیں موجود ہیں، مثلاً: فان قاتلوکم فاقتلوهم (البقرہ ۲:۱۹۱)، ولو قاتلكم الذين كفروا لولوا الادبار (الفتح ۴۸:۲۲)، انما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم فى الدين (الممتحنہ ۶۰:۹)

ان تمام مواقع پر دیکھ لیجیے، کفار کی طرف سے جنگ کی ابتدا کو بیان کرنے کے لیے یہی باب مفاعلہ استعمال ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سوال الگ جواب طلب ہے اگر اس حدیث میں دفاعی جنگ ہی کا بیان ہے تو اس کی غایت قبول اسلام کیوں متعین کی گئی ہے اور یہ کہنے پر کیوں اکتفا نہیں کی گئی کہ ''جب تک کفار فتنہ وفساد سے باز نہ آ جائیں؟''

اسی روایت کی ایک اور تاویل یہ کی گئی ہے کہ اس کا تعلق عین حالت جنگ سے ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر جنگ کے دوران کوئی کافر کلمہ پڑھ لے تو اس کے خلاف لڑائی روک دی جائے۔ مولانا شمس الحق افغانی لکھتے ہیں:

> ''غلط فہمی اس حدیث کے عدم فہم سے واقع ہوئی جس میں ارشاد ہے: امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فاذا قالوها عصموا منى دماء هم واموالهم (ترجمہ) ''میں مامور ہوں کہ لوگوں سے لڑوں اس وقت تک کہ توحید کا اعتراف کریں۔ جب یہ اعتراف کریں تو میری طرف سے ان کی جان ومال محفوظ ہووے''۔ اس سے مستشرقین نے یہ غلط نظریہ جمایا کہ مسلمان تلوار ہاتھ میں گھماتا ہے اور کافر سے یہ کہتا ہے کہ اسلام لاؤ ورنہ تمھارے لیے تلوار ہے۔ ہم آیات واحادیث سے اس کی تردید کر چکے ہیں۔ حدیث مذکور کا تعلق میدان جنگ سے ہے کہ جب عین دوران جنگ میں کوئی کافر لا الٰہ الا اللہ کہہ دے تو رک جاؤ اور اس سے مت لڑو، اگرچہ جان بچانے کے لیے کہے اور دل سے نہ کہے۔'' (مقالات افغانی، ۱/۷۷، ۷۸)

تاہم یہ بھی ایک بالکل بے معنی تاویل ہے جس کو حدیث کا اسلوب بیان قبول کرنے سے صاف انکار کرتا ہے۔ اس میں غیر مبہم طریقے سے قتال کو اللہ کا حکم اور قبول اسلام کو اس کی غایت قرار دیا گیا ہے۔ اگر وہی بات کہنا پیش نظر ہوتی جو مذکورہ تاویل میں کہی گئی ہے تو الفاظ غالباً یہ ہوتے: 'امرت ان لا اقتل من قال لا اله الا الله' (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہہ دے، اسے قتل نہ کروں)۔ علاوہ ازیں یہ توجیہ کرتے ہوئے روایت کے پورے متن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

> امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ويقيموا الصلاة ويوتوا الزكاة فاذا فعلوا ذلك عصموا منى دماء هم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم على الله. (بخاری، رقم ۲۴)

اب اس حکم کو حالت جنگ سے متعلق قرار دینے کی صورت میں ایک عجیب اور بے تکی بات بن جائے گی، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میدان جنگ میں اس شخص کو قتل نہیں کیا جائے گا جو لا الٰہ الا اللہ کہہ دے، نماز ادا کرے اور زکوٰۃ دے دے۔

ہماری رائے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے جہاد کو قرآن وسنت کے نصوص اور ذخیرۂ سیرت کی روشنی میں اس کے اصل تناظر میں سمجھا جائے اور معترضین کو مطمئن کرنے کی غرض سے کوئی رنگ آمیزی کیے بغیر اسے بے کم وکاست پیش کیا جائے۔ خاتمہ بحث کے طور پر یہاں مولانا مودودی کا ایک برمحل اقتباس درج کرنا مناسب دکھائی دیتا ہے:

''میں اس طریقہ سے اصولی اختلاف رکھتا ہوں کہ ہم اپنے عقائد واصول کو دوسروں کے نقطہ نظر کے مطابق ڈھال کر پیش کریں۔..... زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے دین کے عقائد اور احکام کو، اس کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو ان کے اصلی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں اور جو دلائل ہم ان کے حق میں رکھتے ہیں، انھیں بھی صاف صاف بیان کر دیں، پھر یہ بات خود لوگوں کی عقل پر چھوڑ دیں کہ خواہ وہ انھیں قبول کریں یا نہ کریں۔''

(الجہاد فی الاسلام، ۱۶-۱۷)

(باقی)

چونکہ قتل سے بچنا ان شرائط کے پورا کرنے پر موقوف ہے اور اس کا فیصلہ بھی فوری ہونا ہے، اس لیے زیر بحث توجیہ کی رو سے یہ لازم ہوگا کہ اگر کوئی کافر عین میدان جنگ میں 'قتل' سے بچنا چاہتا ہے تو نہ صرف فوری طور پر کلمہ پڑھ لے، بلکہ نماز بھی ادا کرے اور زکوٰۃ بھی دے دے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بالکل بے تکی اور غیر معقول بات ہے۔

عقیل احمد انجم

حقیقی خوشی

سوال یہ ہے کہ سچی خوشی اور اطمینانِ قلب انسان کو کیسے حاصل ہوتا ہے؟ خوشی کے حصول کی بے شمار شکلیں ہیں۔ ہر انسان اپنی طبیعت کے مطابق چیزوں اور باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ خوشی کے لیے طبیعت کی مناسبت لازمی شرط ہے۔ بعض آدمی تاش کھیلنے، ٹی وی دیکھنے اور اپنے دوستوں، رشتہ داروں کے ساتھ گپ ہانکنے اور سارا دن آوارہ گردی کرنے میں گزار دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور ساری زندگی اسی میں مگن رہتے ہیں۔ اور بہت سے آدمیوں صبح سے لے کر شام تک محنت کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس میں خوش رہتے ہیں۔ مناسب طبع کے علاوہ دوسری شرط خوشی کے حصول کے لیے انسان کی اچھی ذہنیت ہے۔ ذہنیت اچھی نہیں ہے تو حقیقی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور مجرمانہ ذہن کے لوگ تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خوشی کیا شے ہے۔ وہ اپنی سوچ کے مطابق اس دنیا میں کامیاب ہو بھی جائیں انھیں اس دنیا میں سب کچھ حاصل ہو بھی جائے تب بھی ان کو حقیقی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ انھیں یہ کہتے ہوئے پانا، کہ میں بہت خوش ہوں۔ ایسا ہی ہے جیسے کنیز کو بیگم کہہ دینا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خوشی نام ہے اطمینانِ قلب کا، نفس کے تزکیے کا، برائی سے اچھائی کی طرف قدم اٹھانے کا، اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (۱۳:۲۸)

''آگاہ رہو کہ اطمینانِ قلب اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے''۔

سچی خوشی حوصلوں کو پست، ارادوں کو متزلزل کر لینے سے نہیں ملتی، سخت سے سخت اذیت برداشت کرنے، دوسروں کے لیے جینے سے حاصل ہوتی ہے۔ اطمینانِ قلب نہ ہو تو عیش وعشرت کے سامان انسان کو خوش نہیں کر سکتے۔ سچی بات

تو یہ ہے کہ حقیقی خوشی صرف انھیں حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو بندہ اللہ کی ہدایت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو پھر اس کے لیے اس دنیا کی مال و دولت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ جو کچھ کماتا ہے۔غریبوں، مسکینوں پر خرچ کرتا ہے۔ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتا ہے۔یتیم جانوں سے دعائیں لیتا ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی عزت پاتا ہے اور آخرت میں بھی اللہ کے نیک بندوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہی اس کا اطمینانِ قلب اور حقیقی خوشی ہے کہ وہ آخرت میں اللہ کے نیک بندوں میں شمار ہوگا۔

عمار خان ناصر / ریحان احمد یوسفی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق اور شعبۂ تعلیم و تربیت کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

ڈاڑھی کا مسئلہ

سوال: میں نے غامدی صاحب کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ڈاڑھی کا دینی احکام سے کوئی تعلق نہیں اور ڈاڑھی رکھنا واجب نہیں، لیکن علامہ راشدی صاحب نے اپنے خطاب میں ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ "مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ میں ڈاڑھی بڑھاؤں اور مونچھوں کو گھٹاؤں۔" اس ضمن میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (محمد بشارت)

جواب: دین میں ڈاڑھی کی حیثیت کے بارے میں استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے دو قول ہیں۔ قول جدید کے مطابق یہ ان کے نزدیک کوئی دینی نوعیت رکھنے والی چیز نہیں، جبکہ قول قدیم یہ ہے کہ اسے دین کے ایک شعار اور انبیا کی سنت کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۸۶ء میں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ": ڈاڑھی نبیوں کی سنت ہے۔ ملت اسلامی میں یہ ایک سنت متواترہ کی حیثیت سے ثابت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان دس چیزوں میں شمار کیا ہے جو آپ کے ارشاد کے مطابق اس فطرت کا تقاضا ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی

ہے:

لا تبدیل لخلق الله ذلك الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون

"اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

''بنی آدم کی قدیم ترین روایت ہے کہ مختلف اقوام وملل اپنی شناخت کے لیے کچھ علامات مقرر کرتی ہیں۔ یہ علامات ان کے لیے ہمیشہ نہایت قابل احترام ہوتی ہیں۔ زندہ قومیں اپنی کسی علامت کو ترک کرتی ہیں، نہ اس کی اہانت گوارا کرتی ہیں۔ اس زمانے میں جھنڈے اور ترانے اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو ہر قوم میں یہی حیثیت حاصل ہے۔ دین کی بنیاد پر جو ملت وجود میں آتی ہے، اس کی علامات میں سے ایک یہ ڈاڑھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دس چیزوں کو فطرت میں سے قرار دیا ہے، ان میں سے ایک ختنہ بھی ہے۔ ختنہ ملت ابراہیمی کی علامت یا شعار ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاڑھی کی حیثیت بھی اس ملت کے شعار کی ہے، چنانچہ کوئی شخص اگر ڈاڑھی نہیں رکھتا تو وہ گویا اپنے اس عمل سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ملت اسلامی میں شامل نہیں ہے۔ اس زمانے میں کوئی شخص اگر اس ملک کے علم اور ترانے کو غیر ضروری قرار دے تو ہمارے یہ دانش ور امید نہیں ہے کہ اسے یہاں جینے کی اجازت دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ دین کے ایک شعار سے بے پروائی اور بعض مواقع پر اس کی اہانت اب ان لوگوں کا شعار بن چکا ہے۔ ہمیں ان کے مقابلے میں بہرحال اپنے شعار پر قائم رہنا چاہیے۔ "(اشراق، ستمبر ۱۹۸۶)

میری طالب علمانہ رائے میں ڈاڑھی کو ایک امر فطرت کے طور پر دینی مطلوبات میں شمار کرنے کے حوالے سے استاذ گرامی کا قول قدیم اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ اس میں ڈاڑھی کو "شعار" مقرر کیے جانے کی جو بات کہی گئی ہے، اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ روایات کے مطابق صحابہ وتابعین کے عہد میں بعض مقدمات میں مجرم کی تذلیل کے لیے سزا کے طور پر اس کی ڈاڑھی مونڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس نوعیت کے فیصلے سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سعد بن ابراہیم اور عمرو بن شعیب سے منقول ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۳۵۲۸۔ اخبار القضاۃ لوکیع ۱/۱۵۹) اگر یہ حضرات ڈاڑھی کو کوئی باقاعدہ شعار سمجھتے تو یقیناً مذکورہ فیصلہ نہ کرتے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی علاقے کے مسلمان اجتماعی طور پر کوئی جرم کریں اور سزا کے طور پر ان کی کسی مسجد کو منہدم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح ڈاڑھی کو دینی شعار سمجھتے ہوئے اسے تعزیراً مونڈ دینے کا فیصلہ بھی ناقابل فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے فقہا کے ہاں عام طور پر یہی موقف اختیار کیا گیا ہے کہ تعزیر کے طور پر کسی مسلمان کی ڈاڑھی نہیں مونڈی جا سکتی۔ واللہ اعلم

ـــــــ عمار خان ناصر

کون سی تفسیر بہتر ہے

سوال: میں جاننا چاہتی ہوں کہ غامدی صاحب کی نظر میں کون سی تفسیر بہتر ہے۔ میں نے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا مطالعہ کیا ہے مگر اس کے کچھ حصوں سے مجھے اتفاق نہیں ہو سکا۔ میں عربی پڑھ اور سمجھ سکتی ہوں اور جب کوئی ترجمہ پڑھتی ہوں تو احتیاط سے کام لیتی ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ اکثر مترجم اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ قرآن، جسے وہ ترجمہ کر رہے ہیں، شاعری سے قریب ہے نثر نہیں۔ وہ لفظی ترجمہ میں اصل مفہوم کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید میں بعض تاریخی واقعات بار بار اور چند دیگر امور وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں اور کچھ اہم باتیں بہت ہی اجمال سے بیان کی گئی ہیں۔ اس وجہ سے بہت اہم مسائل پر اختلاف پیدا ہوا ہے۔

میرا تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ، آدم، فرشتوں اور ابلیس کے مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ابلیس کی سرکشی سے حیرت ہوئی۔ یہ بات مجھے طرز کلام سے سمجھ آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جبکہ اللہ تو سب جانتا ہے۔

میرا چوتھا سوال قرآن کے سمجھنے سے متعلق ہے۔ اگرچہ قرآن عربی میں ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم عربی سیکھیں تاکہ براہ راست کلام اللہ کو سمجھ سکیں اور مترجمین کے مرعون منت نہ رہیں۔ مگر کیا عرب دنیا کے لوگ قرآن کو صحیح سمجھ لیتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ وہ تو بہت اختلاف میں پڑے اور بسا اوقات غلط تاویل کر جاتے ہیں۔ تو صحیح تاویل تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے؟ صحیح تاویل تو ہدایت کی طرف لے جانے والی ہے۔

میں تو ہمیشہ قرآن پر ایمان رکھتی اور عمل کرتی ہوں۔ حدیث کا مطالعہ بھی کرتی ہوں مگر اس کے صحت سند کے حوالے سے سوالات کی وجہ سے بہت احتیاط کرتی ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مذہبی علما سے ہم جو جانتے اور سیکھتے ہیں وہ قرآن کی تعلیمات سے مطابق نہیں ہوتا۔ یہی حال سعودی علما کے فتاویٰ کا ہے۔ غامدی صاحب سے مجھے ہمیشہ آیات کے صحیح معنی جاننے میں مدد ملی ہے۔ کیا وہ کوئی تفسیر یا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اگر نہیں تو وہ کس کی تفسیر یا ترجمہ اختیار کرتے ہیں؟ (ڈاکٹر مدیحہ)

جواب: آپ کے سوالات کے جواب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آپ کے ذوق اور عربی زبان کے حوالے سے آپ کے پس منظر کی بنا پر بہتر ہوگا کہ آپ مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن کا مطالعہ کر لیں۔ امید ہے کہ آپ کے بہت سے اشکالات دور ہو جائیں گے۔

۲۔ قرآن کریم کی دعوت کا بنیادی مقصد انسان کے لیے آخرت کی نجات کا لائحہ عمل واضح کرنا ہے۔ یہی سبب

ہے کہ جن چیزوں پر آخرت کی نجات منحصر ہے، انھیں قرآن کریم نے بہت تفصیل کے ساتھ بار بار بیان کیا ہے۔ ان میں ایمانیات اور اس کے دلائل اور اخلاقی حوالے سے فرد پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ انھی کو عام زبان میں حقوق رب اور حقوق العباد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تاریخی واقعات قرآن کریم میں تاریخ نگاری کے فن کے طور پر بیان نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ ان قوموں کے احوال ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی بعثت ہوئی اور ان قوموں نے رسولوں کی طرف سے دی جانے والی ایمان و اخلاق کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے بعد ایک فیصلے کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا اور انھیں ایک نشان عبرت بنا دیا۔ ان کے تذکرے سے بھی یہی مقصود ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ میں یہ حقیقت نقش ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نتیجے میں انسان اللہ کی گرفت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک شرعی امور کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں بھی یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ان کی بھی قرآن کریم میں بڑی تفصیل کی گئی ہے۔ اور ان میں بھی کوئی بڑا اور اصولی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو یہ Interpretation کی غلطی ہوگی جس کے نتیجے میں آخرت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آنے کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز پر حیرانی نہیں ہوتی۔ اس لیے نہیں ہوتی کہ کوئی بھی چیز ان کے لیے نئی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں یہ بات بیان ہوئی ہو کہ ابلیس کے انکار پر اللہ تعالیٰ کو حیرت ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب اس نے سجدے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے انکار کے سبب کو واضح کرنے کے لیے اسے ایک سوال کی شکل میں پیش کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا تھا کہ دیگر مخلوقات پر ابلیس کی غلطی واضح ہو جائے۔ اس کا سبب یہ بالکل نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے انکار کیوں کیا ہے۔

۴۔ جو مفسر بھی قرآن کی تفسیر لکھتا ہے وہ نہ صرف اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے بلکہ اس کی دلیل بھی دیتا ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے بہتر راستہ یہ ہے کہ وہ مختلف اہل علم کی تفاسیر دیکھ لیا کرے اور جن اہل علم کی رائے اور دلائل پر اس کا اطمینان ہوا سے اختیار کر لے۔ یہی ایک عام آدمی کے لیے قرآن کے مدعا کو پانے کا صحیح راستہ ہے۔

۵۔ ہم نے شروع میں جس تفسیر کا حوالہ دیا ہے یعنی تدبر قرآن، وہ جاوید غامدی صاحب کے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی کی تصنیف ہے۔ جاوید صاحب انھی کے اصولوں کے مطابق قرآن کریم کو سمجھتے ہیں۔ اس پہلو سے بھی آپ اس تفسیر کا مطالعہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جاوید صاحب 'البیان' کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ اور مختصر تفسیر

خود بھی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو بات درست ہے اسے ہمارے دلوں میں راسخ فرما دے اور ہماری غلطیوں کو معاف فرما کر صحیح بات کی طرف ہماری رہنمائی فرمائے، آمین۔

عالمی حکومت کا خواب

سوال: جاوید احمد غامدی صاحب نے ایک ٹی وی پروگرام میں فرمایا: اب انسان اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ ایک عالمی حکومت کا خواب دیکھے۔ اس بات نے میرے ذہن میں بہت الجھن پیدا کر دی ہے۔ میں اس بات کو پوری طرح سمجھنا چاہتا ہوں۔ وضاحت فرمائے؟

میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ کچھ لوگ چند روایات نقل کرتے ہوئے یہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں کہ اگر خالد بن ولید رضی اللہ تعالی چند نفوس کو لے کر ساٹھ ہزار پر مشتمل ایک طاقتور فوج کو شکست دے سکتے ہیں تو پھر اس قرآنی آیت کا کیا مطلب ہے جو غامدی صاحب کے مطابق اس بات کو لازم قرار دیتی ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت تک جنگ نہیں کرنا چاہیے جب تک ان کی حربی قوت دشمن کی حربی قوت کے کم از کم نصف برابر نہ ہو؟ (عامر امین)

جواب: آپ کے سوالات کے جواب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آپ نے جاوید صاحب کی جس وڈیو کا حوالہ دیا ہے اس میں جاوید صاحب کا جملہ یہ ہے:

> ''میرا احساس یہ ہے کہ اب بھی دنیا کو یہ خواب دیکھنے کا حق ہے کہ ایک عالمی حکومت کی طرف ہم بڑھیں، جس میں انسان کی فلاح، انسان کی رفاہیت، غربت کے خلاف جنگ، جہالت کے خلاف جنگ ہمارا مطمح نظر ہو''۔

اس جملے سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ جاوید صاحب کا مدعا یہ ہے کہ انسانیت اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود کچھ ایسی اقدار پر متفق ہو جائے، جو عالمی نوعیت کی ہوں اور جن کی بنیاد پر انسان کی عمومی فلاح و بہبود کے کام کرنا ممکن ہو جائے۔ جس سیاق میں جاوید صاحب بات کر رہے ہیں اس سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس حکومت سے مراد کوئی سیاسی حکومت ہرگز نہیں ہے، بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی خامیوں کو مارکس نے جس طرح متوازن بنانے کی کوشش کی ہے، اس کے حوالے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مراد انسانیت کی اجتماعی دانش کو بروئے کار لا کر ایک متوازن نظام کی طرف پیش قدمی ہے جس کی بنیادی اساس انسانیت کی فلاح ہو۔

۲۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ رواج ہے کہ قرآن کریم کو صحیح، ضعیف اور موضوع روایات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسی نوعیت کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک کا ذکر، حضرت

خالد بن ولید کے حوالے سے ایک تاریخی روایت نقل کر کے آپ نے کیا ہے۔ جب یہ روایات قرآنی بیان کی تائید نہیں کرتیں، تو لوگ ایک نوعیت کے کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن فہمی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ روایات و آثار کو قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جائے۔

اس اصولی بات کے بعد اب آیئے اس روایت کی طرف جسے آپ نے نقل کیا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک تاریخی روایت ہے۔ اور اس کا اپنا متن ہی پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات سے تو سب واقف ہیں کہ جنگِ موتہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ جبکہ رومی لشکر کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ تک لگایا گیا ہے۔ ایک اور تینتیس کے اس تناسب میں حضرت خالد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا گیا کہ وہ اپنے لشکر کو بچا کر کامیابی سے واپس مدینہ لے آئے۔ جبکہ جو تناسب آپ بتا رہے ہیں۔ وہ ایک اور چھ ہزار کا ہے۔ یہ اگر فتح کے حصول کے لیے کوئی کافی تناسب ہوتا تو جنگ موتہ میں وہ صورتحال پیش نہ آتی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کے تین عظیم سپہ سالاروں کی شہادت کے بعد حضرت خالد اس طریقے سے پسپا ہوئے کہ دشمن کو تعاقب کا حوصلہ تک نہ ہو سکا اور اس کے دل پر مسلمانوں کی دہشت چھا گئی۔ یہی ان کا اصل کارنامہ تھا جس پر وہ سیف اللہ کے عظیم خطاب کے حقدار ٹھہرے۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک اور چھ ہزار کے تناسب سے دشمن پر فتح حاصل کرنے کی بات نہ صرف قرآن کے خلاف ہے بلکہ عقل عام اور دیگر مصدقہ تاریخی روایات کے بھی خلاف ہے۔

تبلیغی جماعت

سوال: میں انڈیا سے تعلق رکھتا ہوں اور تبلیغی جماعت سے متعلق ہوں۔ تبلیغی جماعت جیسا کہ آپ جانتے ہیں پوری دنیا میں دین پھیلانے کا کام کرتی ہے۔ کچھ لوگ تبلیغی جماعت کے مشن اور طریق کار پر اعتراض کرتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر تمام لوگ دین کی دعوت کا راستہ چھوڑ دیں تو اسلام کی طرف ہماری رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ فرض کریں کہ یہ تبلیغ غلط ہے اور آج تمام لوگ تبلیغ کے لیے ٹی وی چینلز کھول کر بیٹھ جائیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ان ٹی وی پروگرامز کے دوران بہت سے ایسے اشتہار چلائے جاتے ہیں جن میں عورتوں کی بے ہودگی دکھائی جاتی ہے۔ اب جو لوگ پروگرام دیکھ رہے ہیں وہ اشتہار بھی ضرور دیکھیں گے۔ اور ایسی چیزیں دیکھنے سے ان لوگوں کے اندر غلط خیالات پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ تنہائی میں کوئی غلط حرکت کرنے کے بارے میں بھی سوچ سکتے

ہیں۔تو جولوگ تبلیغی جماعت والوں کے خلاف بولتے ہیں وہ پانچ فیصد دین بھی نہیں سیکھ پاتے۔

جولوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ جاتے ہیں وہ عبادات سیکھ لیتے ہیں، وہ اللہ اوراس کے پیغمبر سے عقیدت پیدا کر لیتے ہیں اورقرآن کی کچھ آیات یاد کر لیتے ہیں۔اگر یہ ٹھیک ہے تو پھر لوگ کس بنا پر کہتے ہیں کہ تبلیغ غلط ہے۔تبلیغی جماعت والے دوسروں کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔وہ اللہ کے راستے میں نکلتے ہیں تو دین پھیلانے کے لیے، نہ کہ سیر کرنے کے لیے۔اس لیے وہ جہاں بھی جائیں وہاں کی مسجد میں قیام کرتے ہیں نہ کہ کسی ہوٹل کے کمرے میں۔برائے مہربانی مجھے بتائیے کہ کیا تبلیغ صحیح ہے یا غلط؟اگر غلط ہے تو کس بنا پر؟ (عبدالقاسم)

جواب: تبلیغی جماعت کئی پہلوؤں سے مفیداور کارآمد خدمات انجام دے رہی ہے۔خاص کراس پہلو سے تبلیغی جماعت کی خدمات قابلِ تحسین ہیں کہ مسلمانوں کے ان طبقات تک اس نے دین پہنچانے کی کوشش کی ہے جن تک عام حالات میں کسی اور ذریعے سے دین پہنچانا ممکن نہیں ہوتا۔جولوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں ہم ان کے اخلاص کے بھی قدردان ہیں کہ وہ اپنے وقت کا ایک حصہ نکال کر دور دراز علاقوں میں سفر کی مشقت اٹھاتے ہیں اور دین سے ناواقف لوگوں تک بنیادی دینی تصورات کا علم پہنچاتے ہیں۔

تاہم، یہ ایک حقیقت ہے کہ کئی پہلوؤں سے تبلیغی جماعت کے کام میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ہمارے نزدیک اس میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ تبلیغی جماعت جس نصاب کی بنیاد پر عام لوگوں تک دین کی دعوت پہنچاتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ ضعیف اور موضوع روایات پر مشتمل ہے۔اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم کی شکل میں جوعظیم ترین نعمت ہمیں حاصل ہے اس کو بنیاد بنا کر یہ کام نہیں کیا جارہا۔ہمارے نزدیک قرآن کریم جب کسی دینی دعوت کی بنیاد نہ ہوتو ایسے دعوتی کام میں افراط وتفریط کا پیدا ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔

اس موضوع پر اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔لیکن اگر ان بنیادی باتوں ہی کی اصلاح کر لی جائے تو ہمارے نزدیک بہت کچھ بہتری آسکتی ہے۔جہاں تک ان لوگوں کا سوال ہے جو ٹی وی چینلز کو ذریعہ بنا کر دین کے حوالے سے کام کررہے ہیں تو ان کو بھی غلط نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔جس مسئلے کا آپ نے ذکر کیا ہے یعنی خواتین کا ٹی وی پر آنا۔ہمارے نزدیک اس کو بنیاد بنا کر ٹی وی چینلز پر دینی کام کو ترک کر دینے پر اصرار درست نہیں۔جولوگ مختلف جگہوں پر جا کر دین کی دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہیں، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انھیں بھی راستوں اور بازاروں سے گزرنا، اور بس اور ریل میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ان تمام جگہوں پر بھی خواتین ایک نامناسب حلیے میں موجود ہو سکتی ہیں اور اکثر ہوا ہی کرتی ہیں۔آپ خواتین سے آنکھیں بند کر کے راستوں سے نہیں گزر سکتے۔آپ کو ہر حال میں اپنی نظر کو بچانا

ہوگا۔لہٰذا جس طرح خواتین کی موجودگی کے باوجود کسی نیک مقصد کی خاطر آپ راستوں اور بازاروں سے گزرنا بند نہیں کر دیتے، بالکل اسی طرح اس چیز کو بنیاد بنا کر آپ مطلقاً ٹی وی دیکھنے کی ممانعت نہیں کر سکتے اور نہ ٹی وی کو ذریعہ بنا کر دینی دعوت پہنچانے کو ممنوع ٹھہرا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو بات درست ہے اسے ہمارے دلوں میں راسخ فرما دے اور ہماری غلطیوں کو معاف فرما کر صحیح بات کی طرف ہماری رہنمائی فرمائے۔آمین۔

ـــــــ ریحان احمد یوسفی

جاوید احمد غامدی

قربانت شوم

اے مری ارضِ وطن کی خاک ، قربانت شوم
ارضِ پاکستان ، خاکِ پاک ، قربانت شوم
تجھ کو مجروح تماشا دیکھ کر جانِ جہاں
بجھ گیا دل ، آنکھ ہے نم ناک ، قربانت شوم
فرقہ بندی کا سمِ قاتل رگ و پے میں رواں
ہے کہیں اِس کا کوئی تریاک؟ قربانت شوم
یہ تری صبحِ درخشاں پر اندھیروں کی ردا
عقل گم ہے ، کھو گیا ادراک ، قربانت شوم
رقصِ وحشت کے لیے بے تاب ملا کے جنود
زہر آگیں ، ظالم و سفاک ، قربانت شوم
مردوزن بے خاناں ہیں ، سر چھپانے کے لیے
رہ گیا اب خیمۂ افلاک ، قربانت شوم

لطمہ ہائے موج ہر سیل حوادث میں فزوں
ہر بلا ہونے لگی بے باک ، قربانت شوم
ڈھونڈتا ہے پھر تری گلیاں ، ترے لیل و نہار
یہ ترا شیدا گریباں چاک ، قربانت شوم
تیرا نخچیر محبت ، تیری یادوں کا اسیر
یہ بھی ہے اک بستۂ فتراک ، قربانت شوم